جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جولائی ۲۰۱۰

وامر بالمعروف
وانہ عن المنکر

مُدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد ۱۲۷، عدد ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ

مدیر: پروفیسر خورشید احمد — نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۵۴۲۵۳۵۶

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۲

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زر سالانہ: ۲۰۰ روپے

بھارت: ۳۵۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۵۰۰ روپے

مشرق وسطی، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۷۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

تاریخ کے دو دَور

ہندستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں کی تاریخ دو دوروں پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا دور سرسید احمد خاں کا دور ہے جس میں مسلمان' ایک مسلک اور ایک مشن رکھنے والی جماعت کے بجائے محض ایک "قوم" بن کر رہ گئے اور اس قوم کی پالیسی یہ قرار پائی کہ اپنی دنیا بنانے کے لیے وقت اور موقع کے لحاظ سے جو طریقۂ کار کارگر نظر آئے' بے تکلف استعمال کیا جائے۔ اگرچہ نام پھر بھی اسلام اور مسلمان ہی کا لیا جاتا تھا مگر جو ذہنیت اس دور میں کارفرما تھی اس کا عطر حالی نے اپنے اس مصرع میں کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ زمانے میں یہ دور اپنی عمرطبعی کو پہنچ گیا اور اس کے بعد اسی کے بطن سے ایک دوسرا دور پیدا ہوا جسے محمد علی' ابوالکلام اور اقبال کا دور کہنا چاہیے۔ یہ دور متضاد اور بے جوڑ عناصر کا ایک ایسا عجیب مجموعہ تھا جس کے مختلف اجزا میں کوئی منطقی ربط نہ تھا اور اسی لیے آخر وقت تک ان کی ترکیب سے کوئی متحد المزاج نظام فکروعمل نہ بن سکا۔ ایک طرف تو اس دور میں وہ اسلامی شعور جو دور اول میں موت کے قریب پہنچ چکا تھا' از سرنو بیدار ہوا اور لوگ اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے لگے' مگر دوسری طرف وہ "مسلم قومیت" جو دور اول میں پیدا ہوئی تھی' ترقی کر کے "مسلم قوم پرستی" میں تبدیل ہو گئی' اور اس دور کے رہنما آخر وقت تک اسلام اور مسلم قوم پرستی کے اصولی فرق کو نہ سمجھ سکے۔ ایک طرف اسلام کا نظریہ اجتماع اور تصور حکومت واضح صورت میں لوگوں کے سامنے آیا' اور دوسری طرف اس بے معنی خلافت کی حمایت بھی کی گئی جس پر اسلامی اصطلاح "خلافت" کا اطلاق کسی طرح نہ ہو سکتا تھا' اس ہندستانی سوراج کے اندر اپنی جگہ بھی تلاش کی جاتی رہی جس کا بنیادی نظریہ اسلام کے نظریۂ سیاسی سے کوئی دور کی نسبت بھی نہ رکھتا تھا' اس غلط جمہوریت کو بھی تسلیم کر لیا گیا جو اسلام کے تصور جمہوریت سے کلیۃً و اصولاً مختلف تھی----

یہ دور اپنے لیڈروں کی وفات اور تیسرے لیڈر کی شخصیت کے انقلاب تام سے اختتام کو پہنچ چکا ہے اور ابھی کوئی تیسرا دور کم از کم اتنی واضح امتیازی خصوصیات کے ساتھ شروع نہیں ہوا ہے کہ اس کے مزاج کی تشخیص کی جاسکے---- ابوالکلام اور اقبال اس دور کے دماغ تھے مگر محمد علی اس کا دل تھا اور بڑا ہی متحرک دل۔ اس کے اندر وضع احتیاط مفقود تھی' اس وجہ سے ہم اس کی تحریروں میں اس کی شخصیت کو بالکل بے پردہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی سیرت' اس کے خیالات' اس کے عزائم' اس کے منصوبے' اور وہ طرز خاص جس سے وہ اپنے پیش نظر مسائل کو سمجھتا اور حل کرتا تھا' سب کے سب آئینے کی طرح ہمارے سامنے آجاتے ہیں (مضامین محمد علی (حصہ اول) از محمد سرور پر تبصرہ' سید ابوالاعلیٰ مودودی' ترجمان القرآن' جلد ۱۶' عدد ۵' جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ' جولائی ۱۹۴۰ء' ص ۴۰۶-۴۰۸)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

مخلوط انتخاب کا شوشہ

پروفیسر خورشید احمد

کسی پہلو سے بھی اسے ایک قوم کی خوش بختی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کا ایک بااثر طبقہ طے شدہ امور کو بار بار متنازع بنانے کی کوشش کرے اور ملک و ملت کو ایک نہ ختم ہونے والے بحث و مباحثے میں الجھائے رکھ کر ذہنی فضا کو مسموم اور پراگندہ (confuse) کرنے کا مرتکب ہو۔ جو دانش ور' صحافی اور سیاست کار اس کے مرتکب ہو رہے ہیں' ان کی مثال' قرآن کی زبان میں' اس عورت کی سی ہے جس نے آپ اپنی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جس سے اللہ نے پناہ کا حکم دیا ہے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ط النحل ۱۶:۹۲)۔

پاکستان کو مسلمانوں کی حالیہ تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ ملک ایک شعوری اور عوامی جمہوری تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور یہ تحریک برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی جدوجہد تھی۔ بلاشبہ پاکستان ان تمام انسانوں کا ملک ہے جو یہاں آباد ہیں اور ایک اجتماعی معاہدے کے تحت سب کے حقوق محترم ہیں لیکن اس حقیقت سے صرف نظر ممکن نہیں کہ یہ ملک نہ کسی فوجی کارروائی کے تحت وجود میں آیا اور نہ ہی اس کے قیام میں برعظیم کے مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم یا گروہ کا کوئی حصہ تھا۔ پھر یہ صرف ان مسلمانوں کی کاوش کا حاصل بھی نہیں جو ان علاقوں کے باسی تھے اور جہاں آزادی کا سبز پرچم لہرایا بلکہ یہ جدوجہد برعظیم کے تمام مسلمانوں نے کی اور یہ ملک ان سب کی قربانیوں کا حاصل ہے اور اس پر سب کا برابر کا حق ہے۔ سب سے بڑھ کر' یہ محض ایک علاقے کی آزادی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ برعظیم کے سیاسی مسئلے کا ایک حل اور برعظیم میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ایک واضح منزل اور اس تک پہنچنے کے لیے ایک کھلی شاہراہ کے حصول کی جدوجہد تھی۔ یہ تحریک اللہ' ملت اسلامیہ پاکستان اور خود

تاریخ سے ایک عہد اور میثاق تھی جس کے نتیجے میں پاکستان کی آزاد مسلم مملکت وجود میں آئی۔

تقسیم ہند کا منصوبہ واضح طور پر نظریاتی بنیادوں پر تقسیم ملک کی تقسیم کا عمل تھا جسے برطانوی حکومت، مسلمانان پاک و ہند اور کانگریس نے طویل بحث و مجادلہ اور افہام و تفہیم کے بعد قبول کیا اور ایک عمرانی معاہدے کے ذریعے دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں جن کا اپنا اپنا واضح تشخص تھا۔ پاکستان کے اسی تشخص کو قرارداد مقاصد اور پھر ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں قانونی اور عملی شکل دی گئی۔ اس کے تین ستون ہیں جو ملت کے اجماع کا مظہر ہیں: یعنی مملکت کا اسلامی تشخص، اس کا جمہوری کردار اور اس کا وفاقی نظام۔ یہ تینوں بنیادیں متفق علیہ اور غیر متنازع ہیں۔ یہ باہم مربوط اور ایک دوسرے کی مضبوطی کا باعث ہیں اور ان کی اہمیت اسی ترتیب سے ہے جس میں یہ قرارداد مقاصد اور دستور میں مرقوم ہیں۔ کوئی ایسا اقدام جو ان میں سے کسی کو بھی مضمحل یا کمزور کرے یا جس کے نتیجے میں ان میں کوئی شگاف آجائے وہ پاکستان سے بے وفائی اور تحریک پاکستان کے شہدا سے غداری کے مترادف ہے۔ ہر قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بنیادوں کی حفاظت کرے اور جو بھی ان پہ تیشہ چلانے کی جرات کرے، اس ہاتھ کو کاٹ ڈالے اور اس کی ضرب کو غیر مؤثر بنا دے۔

طریق انتخاب کا مسئلہ ان تینوں بنیادوں سے متعلق ہے۔ جو حضرات بڑا معصوم چہرہ بنا کر محض لبرل جمہوریت اور مساوات کے نام پر جداگانہ انتخاب کی جگہ مخلوط انتخاب کی بات کر رہے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر پاکستان کی بنیادوں پر تیشہ چلا رہے ہیں اور انھیں یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ناموس رسالتؐ کے سلسلے میں بھی یہی کھیل کھیلا گیا اور اب طریق انتخاب کے سلسلے میں ایسی ہی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ساری حرکتیں ایک مخصوص گروہ کی طرف سے ہو رہی ہیں جو کبھی جمہوریت کی دہائی دیتا ہے، کبھی دعویٰ کرتا ہے کہ ان امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں، کبھی اقلیتوں کے حقوق کی دہائی دی جاتی ہے اور کبھی بنیادی حقوق کا واویلا کیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ خواتین کمیشن کی رپورٹ میں بھی یہ شوشہ چھوڑنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں وہ طبقہ سب سے زیادہ پیش پیش ہے جو این جی اوز کے روپ میں مغربی تہذیب اور اقدار کو فروغ دینے کے لیے سرگرم ہے اور جسے عالمی سیکولر قوتوں کی پشت پناہی حاصل ہے لیکن پاکستان ان تمام قوتوں کے علی الرغم اللہ کے فضل و کرم اور مسلمانان برعظیم کی عوامی جدوجہد کے ذریعے وجود میں آیا ہے اور ان شاء اللہ تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود اپنی اصل بنیادوں پر قائم رہے گا۔ البتہ ہر فتنے کو سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے کہ یہی وہ راستہ ہے جس سے زندہ قومیں اپنے مقاصد اور عزائم کی تکمیل کرتی اور ان کی حفاظت اور ترقی کا سامان کرتی ہیں۔

برعظیم کی تاریخ میں طریق انتخاب کے مسئلے نے بیسویں صدی کے شروع ہی میں اہمیت اختیار کر لی تھی۔ جب سرکاری اداروں میں عوامی نمایندگی کا سوال اٹھا تو فطری طور پر یہ سوال سامنے آیا کہ کس کی نمایندگی کون کرے گا اور اس کے لیے اصل اور بنیاد کیا ہوگی؟ انگریز اور کانگریس کی ہندووانہ سیکولر قیادت تمام ہندستانیوں کے لیے ایک ہی طریق انتخاب کی بات کر رہے تھے جب کہ مسلمان اس بات کے دعوے دار تھے کہ وہ ایک جدا قومی تشخص کے حامل ہیں اور چونکہ ان کے مقابلے میں ہندو آبادی تین گنا زیادہ ہے اس لیے مذہب' تہذیب و ثقافت اور جداگانہ قومی مفاد کو نظرانداز کر کے ایک نام نہاد نیوٹرل (neutral) بنیاد پر مخلوط انتخاب کا طریقہ عملاً ان کو حق رائے دہی سے محروم (disenfranchisement) کرنے کے مترادف ہوگا۔ ابھی تقسیم ملک کی کوئی بات نہیں اٹھی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کی لے بڑے اونچے سروں میں بلند کی جا رہی تھی لیکن شرکت اقتدار اور انتخاب کی بات کے اٹھتے ہی مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص کا اظہار کیا اور بالآخر ۱۹۰۹ء میں مشترک بیلٹ کی جگہ جداگانہ نمایندگی کے اصول کو تسلیم کیا گیا۔ سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ (۲۹-۱۹۲۸ء) کے موقع پر پھر یہ مسئلہ پوری قوت سے اٹھایا گیا۔ کانگریس اور خصوصیت سے پنڈت نہرو نے اس کی زبردست مخالفت کی لیکن مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخص پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔ بعض مسلمان قائدین جو قبل ازیں اس بارے میں متردد تھے' وہ بھی اب کھل کر اس کی تائید میں سینہ سپر ہو گئے اور مسلمان قوم کے اجتماعی فیصلے کو تسلیم کرانے کے لیے ڈٹ گئے بلکہ اس کے منطقی تقاضے یعنی مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے نصب العین پر جمع ہونے لگے۔

سیکولر قوتوں کا موقف یہ تھا کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اس کا سیاست' ریاست اور انتخابی عمل سے کوئی تعلق نہیں جبکہ مسلمانوں کا موقف یہ تھا کہ ان کا مذہب محض انفرادی عقیدے اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہی ان کی اجتماعیت کی بنیاد' ان کی قومیت کی اساس اور ان کے اجتماعی کردار کا صورت گر ہے۔ مغرب کی لبرل اور سیکولر جمہوریت مسلمان کی منزل نہیں ہو سکتی۔ مسلمان جس جمہوریت کے قائل ہیں وہ اللہ کی حاکمیت اور شریعت کے فریم ورک میں قائم ہوتی ہے اور دین اور سیاست دو جداگانہ دنیاؤں سے متعلق نہیں بلکہ ان کی سیاست بھی دین کی اسی طرح پابند ہے جس طرح ان کی عبادت۔ اقبال نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال نے اپنے ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبے میں تو گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ انھوں نے مغربی فکر و تہذیب اور اسلامی نظریہ اور تاریخ کے فرق کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا جو تحریک پاکستان کی بنیاد اور اس کی علت غائی (raison detre) بن گئی:

> سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا......
>
> لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے' اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو' لیکن اس کے باہر اس کے گردوپیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لیے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے' الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کے ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے (Thoughts and Reflections of Iqbal, p 166-167)

اسلام کے اس مخصوص مزاج اور تاریخی کردار کا تقاضا تھا کہ ریاستی نظام کی بنیاد اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی نظریاتی وحدت پر ہو اور اس نظام میں دوسری قوموں اور گروہوں کو ان کے تشخص کے مطابق زندہ رہنے' ترقی کرنے اور اجتماعی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ مسلم ریاست اسی نظریاتی شعور پر اپنا اجتماعی اور سیاسی نظام قائم کرتی ہے۔ نہ مسلمانوں کے تشخص کو کمزور کیا جاتا ہے اور نہ دوسری قوموں کو اجتماعیت کے نام پر ان کے تشخص سے محروم کیا جاتا ہے۔ یہ یک قومی ریاست نہیں کثیر قومی ریاست ہے

(state of nationalities) اور اس طرح ایک معتبر کثیر قومی ہیئت (pluralism) کی بنیاد پر اجتماعی تعاون اور استحکام حاصل کیا جاتا ہے۔ دولت عثمانیہ میں تنظیمات کا نظام اسی کثیر قومی ہیئت کی ایک تاریخی مثال ہے۔ برعظیم میں جداگانہ طریق انتخاب کے ذریعے ایک مختلف سیاسی تناظر میں اسی مقصد کو حاصل کیا گیا اور آزادی کے بعد انھی مقاصد اور اہداف کے حصول کے لیے پاکستان کے مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کے طریقے کو ایک ایسی شکل دینے کی کوشش کی کہ مسلم قوم کی نمایندگی بھی بھرپور انداز میں ہو سکے اور دوسری

مخالفت کے باوجود لوکل باڈیز میں مخلوط انتخاب جاری کرنے کا قانون پاس کیا۔ کیا جمہوری حکومت کا یہی شیوہ ہوا کرتا ہے کہ جس قوم یا فرقے کے لیے چاہے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق قانون وضع کرے اور اس قوم و فرقے کے نمایندوں کی مرضی اور منشا کا کوئی لحاظ نہ رکھے؟ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کو ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہیے اسی طرح امیدوار بننے کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ مخلوط انتخاب کی صورت میں جو امیدوار کامیاب ہوں گے وہ غیر قوم یعنی اکثریت کے ووٹوں سے کامیاب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خواہش ہے کہ ان کا نمایندہ وہ ہو جسے خود مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ ملے ہوں' نہ یہ کہ ووٹ تو دوسروں سے ملے ہوں اور وہ نمایندہ مسلمانوں کا ہو" (روزنامہ انقلاب ' لاہور' ۱۲ جون ۱۹۳۸ء۔ گفتار قائداعظم' مرتبہ: احمد سعید' ص ۲۱۲-۲۱۶)

قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کو اس کے مخصوص سیاسی پس منظر اور قائداعظم کے اسی موضوع پر دو سو سے زیادہ اقوال کو نظرانداز کر کے' ایک گروہ متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مسلمانوں کی پوری تاریخ' اور خصوصیت سے برعظیم میں قیام پاکستان سے قبل اور اس کے بعد کے حقائق و حالات کے خلاف علم بغاوت ہے۔ طریق انتخاب کے مسئلے کا تعلق ایک قوم اور گروہ کے اس حق سے ہے کہ اس کی نمایندگی وہ افراد کریں جو اس میں سے ہوں اور اس کے عقائد و نظریات' پروگرام اور عزائم' تہذیب و اقدار اور ترجیحات کی صحیح نمایندگی کر سکیں۔ اس کا تعلق ملک کی شہریت سے نہیں۔ شہری تو ہر عمر کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ووٹ کا حق صرف ایک خاص عمر تک پہنچنے والوں ہی کو ملتا ہے۔ اسی طرح مختلف عقائد' تصورات اور تہذیبی و مذہبی تشخص رکھنے والے افراد ملک کے شہری اور برابر کے شہری ہو سکتے ہیں لیکن نمایندگی اور پالیسی سازی پر اثراندازی کے باب میں انصاف کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ہر تہذیبی اور مذہبی کیمونٹی کی نمایندگی اس کے اپنے لوگ کریں۔ اسے حاصل کرنے کے لیے جداگانہ انتخاب کا طریقہ ایک معقول اور فطری طریقہ ہے۔ متناسب نمایندگی کے نظام کے ذریعے بھی یہ مقصد ایک حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر مخلوط انتخاب تو نمایندگی کا وہ بھونڈا اور ظالمانہ نظام ہے جس کے ذریعے دینی' نظریاتی اور تہذیبی تشخص کی نفی ہوتی ہے اور محض ووٹوں کی ہیراپھیری اور نمبروں کی سیاست کے ذریعے ایک طبقے کو سب پر اپنی بالادستی قائم کرنے کا مؤثر حربہ مل جاتا ہے اور یک رنگی اور مساوات کے نام پر حقیقی تنوع کی نفی کی جاتی ہے۔

مسلمان بحیثیت قوم نہ اس پالیسی کو اس وقت صحیح سمجھتے تھے جب وہ برعظیم میں اقلیت میں تھے اور نہ اس وقت صحیح سمجھتے ہیں جب وہ ایک آزاد مملکت میں اکثریت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اور نظریاتی قوتوں نے جداگانہ طریق انتخاب کو پاکستان کے سیاسی نظام اور دستور میں قائم رکھنے کی کوشش کی اور صرف

سیکولر عناصر اور خصوصیت سے کانگریس کے حامیوں اور مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے مخلوط انتخاب کے لیے سازشیں کیں۔ علماے کرام نے ۱۹۵۱ء میں اسلامی ریاست کے جو ۲۲ اصول مرتب کیے ان میں جداگانہ انتخاب کو بنیاد بنایا گیا۔ (ملاحظہ ہو اصول نمبر ۳' ۵' ۱۰ اور ۱۱)۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء کی دستوری سفارشات میں علماے کرام نے اسی اصول کی تائید کی۔ خود لیاقت علی خاں کی بنیادی اصولوں کی رپورٹ (۱۹۵۰ء)' ناظم الدین رپورٹ (۱۹۵۲ء)' محمد علی بوگرہ رپورٹ (۱۹۵۴ء) میں جداگانہ اصول ہی کی سفارش کی گئی۔

مشرقی پاکستان کے ۱۹۵۴ء کے انتخاب اسی اصول پر منعقد ہوئے اور جگتو فرنٹ کے ۲۲ نکات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہ تھا۔ البتہ ایک بار مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو مشرقی پاکستان اسمبلی اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں میں سے سیکولر عناصر سے گٹھ جوڑ کر کے جو توازن طاقت (leverage) حاصل ہوا اس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے اس اصول پر تیشہ چلانے کی کوشش کی۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کے تحت اس مسئلے پر رائے دیتے ہوئے مغربی پاکستان کی اسمبلی نے ۳۱۰ ارکان کے ایوان میں ۳۰۰ ارکان کی اکثریت نے جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دیا۔ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت نے جداگانہ انتخاب کے حق میں ووٹ دیا' البتہ ۶۰ ہندو ووٹوں کا سہارا لے کر عوامی لیگ نے معمولی اکثریت سے مخلوط انتخاب کے حق میں اکثریت حاصل کرلی اور اس طرح نظام انتخاب میں یہ بارودی سرنگ لگ گئی جس نے' جیسا کہ خطرے کا اظہار کیا گیا تھا' بنگالی قومیت کو فروغ دیا اور بالآخر پاکستان دولخت ہوگیا۔ مولانا مودودی نے ۱۹۵۵ء میں اپنے ایک بصیرت افروز مضمون میں اس خدشے کا برملا اظہار کیا تھا کہ اگر مخلوط انتخاب کے طریقے کو ملک پر مسلط کیا گیا تو سب سے پہلے مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت کا فتنہ اٹھے گا اور پھر مغربی پاکستان بھی اس کا نشانہ بنے گا۔

(Islamic Law and Constitution by Maulana Maudoodi, p 331)

ڈاکٹر وحید قریشی اس مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے رجحانات کو جن عوامل نے تقویت دی ان میں ایک طریقہ انتخاب تھا۔ حکومت پاکستان نے عیسائیوں کا پیش کردہ جداگانہ انتخاب رد کر کے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا پیش کردہ مخلوط انتخاب قبول کر لیا تھا۔ نتیجے کے طور پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کے نمایندوں پر ہندو ووٹوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور اس نے علیحدگی کی تحریک کو مضبوط کیا (Ideological Foundation of Pakistan, p 193)۔

یہ اس لیے ہوا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق:

> جداگانہ انتخاب ختم کر کے بالواسطہ طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ مشرقی پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں (ص ۲۵)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحان کو پروان چڑھانے والے عوامل متعدد تھے۔ جن عوامل نے اہم کردار ادا کیا ان میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاسی قائدین اور افسرشاہی کا رویہ، ضرورت سے زیادہ مرکزیت کا فروغ، وسائل کی تقسیم میں ناانصافی اور جمہوری عمل کا تعطل اور تمام علاقوں کے لوگوں کی اقتدار میں شرکت (political participation) میں کمی کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ملک کی نظریاتی بنیاد کی کمزوری، اور خصوصیت سے نظام انتخاب کی تبدیلی کے ذریعے اسلامی قومیت پر ضرب کاری کا حالات کو خراب کرنے میں بڑا دخل ہے جس کا مقامی ہندو قوتوں اور بھارت نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مخلوط انتخاب کے نظام کا اس میں بڑا اہم کردار رہا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے سقوط ڈھاکہ کے بعد ایک تفصیلی انٹرویو میں حالات کا بے لاگ جائزہ لیا تھا۔ ان کے یہ الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں:

علیحدگی کی طرف ایک اور قدم اور بڑا مؤثر قدم مخلوط انتخاب تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جس طرح پاکستان کی پارٹیوں نے مل ملا کر ایک دستور بنایا تھا اور اس میں اسلام کی بنیاد پر نظام حکومت تعمیر کرنے کی جو بنا رکھی گئی تھی، اسے اگر کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو شاید ان اسباب کی تلافی کی جاسکتی تھی جو ملک کے دونوں حصوں کو علیحدگی کی طرف لے جا رہے تھے۔ لیکن سکندر مرزا صاحب اور سہروردی صاحب نے زبردستی مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے اس دستور میں ایک ایسی نقب لگا دی جس سے وہ پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے کوئی خدمت انجام دینے کے قابل نہ رہا۔ ہم نے اس وقت یہ سمجھانے کی انتہائی کوشش کی کہ مخلوط انتخاب پاکستان کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ اس کے بجائے جداگانہ انتخاب باقی رہنا چاہیے۔ بلکہ وہ بھی اس طرز کا نہ ہونا چاہیے جو انگریزوں نے ہندوستان میں رائج کیا تھا کہ ایک طرف مسلمان تنہا ہوں اور دوسری طرف تمام غیر مسلموں کو ملا کر ایک کر دیا جائے جس کا پورا فائدہ اونچی ذات کے ہندوؤں کو حاصل ہو۔ بلکہ مسلمان، اونچی ذات کے ہندو، آدی باسی ہندو (شیڈولڈ کاسٹ) عیسائی، بودھ، سب کے الگ الگ حلقہ ہاے انتخاب ہونے چاہییں اور آبادی کی بنیاد پر ان کو جداگانہ نمایندگی دینی چاہیے۔ لیکن ان لوگوں کے پیش نظر یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کسی طرح نہ چلنے پائے اور یہ ایک سیکولر ریاست ہی بن کر رہے۔ اس لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی سخت مخالفت کے باوجود انھوں نے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے چھوڑا۔ یہ اگرچہ اصولی حیثیت سے پورے پاکستان ہی کے لیے غلط تھا، لیکن عملاً اس کا اصل نقصان مشرقی پاکستان کو پہنچا تھا (سید ابوالاعلیٰ مودودی، روزنامہ جسارت، ۹ دسمبر ۱۹۷۲ء بحوالہ مولانا مودودی کے انٹرویو، اول، ص ۵۱۵-۵۱۶)۔

مخلوط انتخاب کے نتیجے میں سیکولر قوتوں کی تقویت اور متحدہ قومیت کے علم برداروں کی بالآخر کامیابی

ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پاکستان کو دولخت کرنے اور برعظیم کے نظریاتی نقشے کو تہ و بالا کرنے میں اس تاریخی بھیانک (blunder) کا بڑا دخل ہے۔

یہ تو پاکستان کا حشر ہوا۔ بھارت کی کہانی بھی بڑی سبق آموز ہے۔ آزادی کے بعد کانگریس نے مخلوط انتخاب مسلط کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ دستور ساز اسمبلی کی متعلقہ کمیٹی نے بڑی رد و کد کے بعد جداگانہ انتخاب کو تو ختم کرنے کی سفارش کی لیکن مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے اسمبلی میں نشستیں مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر کمیٹی میں اتفاق رائے حاصل کیا گیا مگر دستور ساز اسمبلی میں پھر قلابازی کھائی گئی اور اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی دفعہ خارج کر دی گئی۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے لیاقت نہرو معاہدے میں بھی ایسی ہی عیاری کی گئی تھی۔ اصل معاہدے میں اقلیتوں کے لیے دونوں ملکوں میں نمایندگی کی ضمانت پر دونوں وزراے اعظم میں اتفاق ہوا تھا۔ این وی گیڈ جل (N.V.Gadgil) نہرو کی کابینہ میں وزیر تھا اور معاہدے کے مذاکرات میں بھی شریک' اپنی کتاب "Government from Inside" میں اعتراف کرتا ہے:

> اصل معاہدے میں دو پیراگراف تھے جس میں مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے تمام ملازمتوں میں نشستوں کے تحفظ کو' اور ہندستان کی تمام ریاستوں میں نمایندگی کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ایسی ہی دفعات مرکزی اسمبلی کے لیے تجویز کی گئی تھیں (ص ۸۶)۔

شیخ محمد اکرام پاکستانی وفد میں شامل تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس نوعیت کی تجویز مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کے بارے میں بھی معاہدے میں شامل تھی مگر پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں کے درمیان اتفاق کے باوجود سردار پٹیل اڑ گئے اور بقول گیڈ جل بھارتی کابینہ نے اس حصے کو تسلیم نہیں کیا اور پنڈت نہرو کے اس اصرار کے باوجود کہ وہ لیاقت علی خان سے اس اصول پر اتفاق کر چکے ہیں' کابینہ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا (گیڈ جل' ص ۸۷)۔ کابینہ کا فیصلہ تھا کہ: ان دونوں تجاویز کو پورے کا پورا مکمل مسترد کر دیا جائے (دیکھیے: Modern Muslim India and the Birth of Pakistan از شیخ محمد اکرام' لاہور' ۱۹۹۰ء' ص ۴۶۲)۔

اور یہ سب سیکولرزم کے نام پر!

اقلیتوں کی نمایندگی کی ایک دوسری شکل متناسب نمایندگی کی بنیاد پر انتخاب کے نظام میں ممکن تھی۔ نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) میں اس طریق انتخاب کا ذکر ہے بلکہ اس کی افادیت کا اعتراف بھی ہے۔

> ہم اس نظام میں بڑی کشش محسوس کرتے ہیں اور اس رائے کے حامل ہیں کہ مختلف طبقوں کے دعووں اور اندیشوں کے حوالے سے یہ واحد معقول اور منصفانہ راستہ ہے۔ اس میں ہر اقلیت کے

میں بیٹھا تھا جن کی مالی حالت کمزور تھی اور ان میں سے بعض کے پاس اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ ستر عورت کر سکتے۔ وہ ایک دوسرے کے جسم کو اپنے لیے ساتر بناتے تھے۔ ایک شخص قرآن پاک پڑھ رہا تھا اور سب سن رہے تھے۔ اس دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھڑے ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو قاری خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے حلقے پر سلام کیا اور پوچھا: آپ لوگ کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے قاری قرآن پڑھ رہے تھے اور ہم کتاب اللہ کو سن رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ان کی معیت اختیار کروں۔ یہ فرما کر آپؐ ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے تاکہ آپؐ اپنی ذات اقدس کو ہماری مجلس میں برابر کا شریک کر دیں۔ پھر آپؐ نے ہاتھ مبارک کے اشارے سے حلقے کو درست کرنے کی طرف اشارہ فرمایا' جس کے نتیجے میں تمام لوگوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ میں وہ واحد خوش قسمت تھا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: اے ہجرت کرنے والے فقیرو! خوش خبری قبول کرو کہ قیامت کے روز تمھیں "نور تام" نصیب ہو گا۔ تم مال داروں سے آدھا دن قبل جنت میں داخل ہو گے۔ آدھا دن پانچ سو سال کا ہو گا (ترمذی' ابوداود)۔

اسلامی روایت میں فقر کی بڑی اہمیت ہے۔ جدید دور میں معاشی خوش حالی قبلہ و کعبہ بن گئی ہے۔ اسلامی فکر میں معاشی خوش حالی ممنوع نہیں' لیکن اسے نصب العین' اور زندگی کا مطلوب و مقصود بنا لینا بھی روا نہیں۔ قناعت اور شکر ہمارے دو ایسے تصورات ہیں جن سے مغربی دنیا واقف نہیں۔ اجتماعی زندگی میں ان کی عملی اہمیت پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

ایسے لوگ جو علم دین کے حصول میں' قرآن کے ذکر میں اس طرح مشغول ہوں کہ عرف عام میں انھیں اپنی دنیا کی بالکل فکر نہ ہو' اس حد تک کہ لباس تک مناسب نہ ہو' ہم لوگ معلوم نہیں ایسے لوگوں کو کیا سمجھیں اور مشورہ دیں' اللہ کے رسولؐ نے تو انھیں مال داروں سے پانچ سو سال قبل جنت میں جانے کی خوش خبری دی اور خود ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

○

حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں' میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تین دن ہو گئے ہیں پیٹ میں کوئی ایسی چیز نہیں گئی جو کسی ذی روح کے پیٹ میں جاتی ہے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں'

سازشیں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے' نہ بھارت میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی حالت سے کوئی سبق لینے کے لیے تیار ہیں اور نہ خود اپنی تاریخ سے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اصل مسئلہ ریاست اور دین کے تعلق اور ملکی سیاست میں دین کے کردار کا ہے۔ طریق انتخاب کا مسئلہ اس کا ایک جزو ہے اور اس اصل مسئلے کے بارے میں تبدیلی کے لیے زینے کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر ریاست کی بنیاد دین پر ہے اور خدا کی حاکمیت کے اصول کی روشنی میں نظام حکومت کو چلنا ہے تو پھر قیادت اور اجتماعی فیصلہ کرنے والے اداروں میں نمایندگی کا انحصار بھی مذہب' تہذیب و تمدن اور اجتماعی نظام کے نظریاتی رخ پر ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں جس طرح ناخن سے گوشت اور پھول سے اس کی خوشبو۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ہو یا بھارت' جداگانہ اور مخلوط انتخاب کی ساری بحث دینی اور قومی نمایندگی کے محور پر ہی گردش کرتی رہی ہے۔ جن عناصر کی طرف سے آج یہ بات اٹھائی جا رہی ہے وہ اعلانیہ طور پر سیکولرزم اور دین اور سیاست کی دوئی اور علیحدگی کے علم بردار ہیں' جب کہ وہ تمام افراد اور جماعتیں جو سیاسی نظام کے لیے دین کی رہنمائی کو ضروری سمجھتے ہیں' وہ جداگانہ طریق انتخاب' یعنی نمایندوں کا دینی اور قومی تشخص کی بنیاد پر انتخاب' ضروری سمجھتے ہیں۔

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ایک بدیہی امر اور اسلامی ریاست کی دینی ذمہ داری ہے لیکن چند اقلیتی عناصر کو خوش کرنے کے لیے ریاست کی بنیاد کو تبدیل یا کمزور کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہے اور پاکستان کے تصور اور تحریک پاکستان کے رہنما نظریے کے خلاف ہے۔ قائداعظم نے صاف الفاظ میں کہا تھا:

> جس دن ہندستان میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا اسی لمحے پاکستان کے قیام کا آغاز ہو گیا۔ جوں ہی ایک ہندو نے اسلام قبول کیا' اسے نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ معاشرتی' ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اچھوت قرار دے دیا گیا۔ جہاں تک مسلمان کا تعلق تھا' اسلام نے اس پر یہ فرض عائد کر دیا کہ وہ اپنی شناخت اور انفرادیت کو کسی اجنبی معاشرے میں ضم نہ کرے۔ زمانہ قدیم سے عہد بہ عہد ہندو' ہندو رہے اور مسلمان' مسلمان۔ انھوں نے اپنی شخصیتوں کو ایک دوسرے میں ضم نہیں کیا۔ یہ ہے بنیاد پاکستان کی (علی گڑھ میں خطاب' مارچ ۱۹۴۴ء بحوالہ Speeches and Writings of Mr. Jinnah' ج ۳' ص ۲)۔

کیا کوئی سمجھ دار آدمی اس کا تصور کر سکتا ہے کہ اگر یہ فرق پاکستان کی بنیاد ہے تو پاکستان کے بنتے ہی یہ بنیاد غائب ہو جائے گی اور جو دھارے ہزار سال نہ مل سکے وہ مل کر ایک قوم بن جائیں گے۔ کیا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد قرآن اور اسوۂ رسالت مآبؐ بدل گئے؟ کیا ہمارے خیروشر کے پیمانے تبدیل ہو

گئے؟ کیا حرام و حلال میں تبدیلی واقع ہو گئی؟ کیا تاریخ و ثقافت نے رنگ بدل لیا؟ کیا آرٹ اور فن تعمیر نے چولا بدل لیا؟ اگر نہیں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے انتخاب' نمایندگی اور ترجیح کے پیمانے آخر کیوں ایک ہو جائیں۔

اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق دینا ہماری ذمہ داری ہے اور خدا اور خلق سے ہمارا عہد ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست کی بنیادوں کو منہدم کر دیا جائے' اس کی منزل کو تبدیل کر دیا جائے اور خود مسلمانوں سے جو عہد کیا گیا ہے اسے دریا برد کر دیا جائے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم اور قائداعظم کے دست راست خان لیاقت علی خاں نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی تحریک پیش کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا تھا:

> اس معاملے میں بابائے قوم قائداعظم نے کئی موقعوں پر اپنے جذبات کا اظہار کیا اور قوم نے ان کے خیالات کی بالکل واضح الفاظ میں توثیق کی--- قائداعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے اس امر کے حوالے سے غیر مبہم اور واضح اعلانات کیے کہ پاکستان کے لیے مسلمانوں کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کا اپنا طریقہ حیات اور طرز معاشرت ہے۔ انھوں نے اس بات کو بھی بار بار دہرایا کہ اسلام محض فرد اور اس کے خدا کے درمیان ایسا رشتہ نہیں ہے جو ریاست کے معاملات کو متاثر نہ کرتا ہو۔

اور قائداعظم کے دوسرے معتمد ساتھی سردار عبدالرب نشتر نے دستور ساز اسمبلی میں ۱۰ مارچ کو اپنے خطاب میں کہا تھا:

> یہ صحیح ہے کہ قائداعظم نے اقلیتوں کو ضمانت دی تھی' لیکن قائداعظم نے اکثریت کو بھی اسی طرح ضمانت دی تھی۔ پاکستان کا مطالبہ ایک متعین نظریہ حیات اور متعین مقصد کی خاطر کیا گیا تھا اور یہ قرارداد جو پیش کی گئی ہے ان سوچی سمجھی اور ٹھوس یقین دہانیوں کے مطابق ہے جو قائداعظم اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے اکثریت اور اقلیتوں کو کروائی تھیں۔

دین کی بنیاد پر دستور اور سیاسی نظام کی تشکیل اور دینی اور تہذیبی تشخص کے مطابق نمایندگی کا اصول اسی وقت طے ہو گیا تھا جب قرارداد مقاصد منظور ہوئی اور جس پر ہمارا دستور مبنی ہے۔ حسین شہید سہروردی اور ذوالفقار علی بھٹو کا مخلوط انتخاب مسلط کرنے کا اقدام ہندو قوتوں اور سیکولر عناصر کے آگے سپر ڈالنے اور پاکستان کے نظریے' مقاصد اور قرارداد مقاصد سے بے وفائی کے مترادف تھا۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے متفقہ ووٹ کے ذریعے جداگانہ انتخاب کا احیا اس غلطی کی تصحیح تھی جو ماضی میں کی گئی تھی اور جس کا قوم نے عظیم خمیازہ بھگتا تھا۔ آج اس بحث کو اٹھانا ایک بار پھر نظریہ پاکستان اور دستور کی اساس پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے اور اسلام اور ملکی مفاد دونوں کے منافی ہے۔

قرآن پاک نے ایک اسلامی ریاست میں نمایندگی کے اصول کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج (النساء ۴:۵۹) اے ایمان والو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اللہ کے رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اصحاب امر ہیں۔

یہاں مِنْکُمْ کی نص صریح نے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں میں سے مسلمانوں کے نمایندوں اور اصحاب امر کے انتخاب کے مسئلے کو طے کر دیا۔

اسی طرح قیادت اور اطاعت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے واضح ہدایت دے دی:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف ۱۸:۲۸) کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

مسلمانوں کی قیادت کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود ان میں سے ہوں، جن کے دل و نظر اللہ کے ذکر سے معمور ہوں، جو اپنی خواہش نفس کو اللہ کی دی ہوئی ہدایت کے تابع کریں اور جو ان حدود کی پاسداری کریں جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرما دی ہیں۔ صرف ایسے ہی لوگوں کو نمایندگی کے مقام پر فائز کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا لا (النساء ۴:۵۸) اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت کے سپرد کرو۔

ان ہدایات پر عمل صرف جداگانہ انتخاب یا کسی ایسے انتخابی عمل ہی میں ممکن ہے جس میں مسلمان اپنے نمایندے خود منتخب کریں اور اسی طرح دوسرے مذاہب کے پیرو بھی اپنے مذہب اور تہذیبی مزاج کے مطابق اپنوں میں سے اپنے نمایندے منتخب کریں۔

اتنی صاف بات کو خلط مبحث سے پراگندہ کرنے کے لیے چند دانش ور بڑے دور کی کوڑی لائے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت قرار دیا تھا اور اسی کی روشنی میں آج بھی ایک اسلامی ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت تصور کر کے مخلوط انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس مضحکہ خیز دلیل پر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ:

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات یہ بات بڑے زور و شور سے پیش کر رہے ہیں انھوں نے میثاق مدینہ کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور محض عنوان دیکھ کر یا سنی سنائی باتوں پر فتویٰ صادر فرما رہے ہیں۔ اس میثاق میں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک مشترک نظام میں ان کے جداگانہ تشخص کی بنیاد پر مربوط کیا گیا ہے اور ہر ایک کے جداگانہ تشخص کا ہر معاملے میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس معاہدے میں ایک طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ایک سیاسی نظام میں مل کر رہنے کا واضح نقشہ موجود ہے تو دوسری طرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اپنے اپنے جداگانہ وجود کی مکمل حفاظت اور مالی ذمہ داری تک میں علیحدہ علیحدہ نظام کو برقرار رکھا گیا ہے۔ یہ مخلوط نظام کا نہیں' مختلف مذہب کے پیروؤں اور قوموں کے درمیان اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے منصفانہ اشتراک اور تعاون کا ایک ماڈل ہے۔ مشترک شہریت' اسلام کی بالادستی' نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور آخری اتھارٹی تسلیم کیا جانا اور ہر ہر گروہ کے مساوات اور انصاف کے مطابق حقوق و فرائض اور مالی ذمہ داریوں کا تعین' ان ساری تفصیلات کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی اسے مخلوط طریق انتخاب کے لیے نمونہ اور دلیل قرار دینے کی جسارت کرتا ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" اور ع

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو' جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں اپنی بات برعظیم کی تاریخ' تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس' قائدین تحریک کے وعدوں اور اعلانات' اسلامی ریاست کے مزاج اور مفاد اور پھر قرآن و سنت کے احکام اور نمونے کی روشنی میں کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیکولر جمہوریت کے علم برادروں کو خود مغرب کی سیاسی فکر اور لبرل جمہوریت کے اصولوں اور تجربات کا آئینہ بھی دکھا دیا جائے تاکہ ان کے ترکش میں یہ تیر بھی باقی نہ رہے کہ جداگانہ انتخاب کا نظام تو محض مذہبی جنونیوں کے ذہن کی اختراع ہے اور لبرل جمہوریت جس مساوات کی بات کرتی ہے' یہ اس کی ضد ہے۔

یہ دعویٰ کہ مغربی طرز کے جمہوری نظام میں اگر سب شہریوں کو بلالحاظ ان کے عقائد' زبان' نسل' تہذیبی اور ثقافتی تشخص کے ووٹ کا حق دیا جائے تو اقلیتوں کو حقیقی مساوات حاصل ہو جاتی ہے اور اکثریت اور اقلیت کا تصادم اور استحصال ختم ہو جاتا ہے' ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقیقت کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ امریکہ کی میری لینڈ یونی ورسٹی کے علم سیاست و حکمرانی کے پروفیسر ٹیڈ رابرٹ گور (Ted Robert Gurr) نے برسوں کی تحقیق کے بعد ایک کتاب Minorities at Risk (اقلیتیں معرض

خطر میں) لکھی ہے جو ۱۹۹۳ء میں واشنگٹن سے شائع ہوئی ہے۔ دنیا کے ۲۳۳ اقلیتی گروہوں کے حالات کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے بعد پروفیسر گور لکھتا ہے کہ گذشتہ ۵۰ سال میں اقلیتوں کے مسائل میں اضافہ ہوا ہے جو تصادم اور تشدد پر منتج ہوا ہے۔

یونی ورسٹی آف اوٹاوا کے سیاسی فلسفہ کے پروفیسرول کیم لیکا (Will Kymlicka) جسے ۹۵-۱۹۹۴ء کا نظریہ سیاسی کا میک فرسن (Macpherson) انعام دیا گیا ہے' واضح اور مدلل انداز میں صرف جداگانہ انتخاب ہی نہیں' کثیر ثقافتی شہریت (multicultural citizenship) کا نظریہ پیش کر رہا ہے۔ اس کی کتاب Multicultural Citizenship (کثیر ثقافتی شہریت) ۱۹۹۶ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج دنیا کے ۱۸۴ ممالک میں ۶۰۰ لسانی گروہ اور ۵ ہزار نسلی گروہ پائے جاتے ہیں جہاں اقلیتوں اور اکثریتی گروہوں میں مسلسل کشمکش اور تصادم کی کیفیت ہے اور لبرل جمہوریت اس کا کوئی حل پیش نہیں کر سکی ہے۔

جمہوری نظاموں میں جب تصورات اور زمینی حقائق میں مطابقت نہیں ہوتی تو پھر اقلیتوں کے وجود کو ختم کرنے (physical elimination) کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں یکسانی و یک رنگی پیدا ہو جائے۔ اس کا راستہ بڑی تعداد میں ملک بدری' نسلی تطہیر اور اجتماعی قتل و خون ریزی رہا ہے۔ جہاں یہ نہیں ہوا وہاں اقلیتوں کو عملاً جبری طور پر اکثریت کی زبان' مذہب اور طور طریقوں کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

لبرل مفکرین کو توقع تھی کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے عالمی اور قانونی اقدامات سے اقلیتوں کو تحفظ حاصل ہوگا مگر اقوام متحدہ کا اعلامیہ قومی اقلیتوں کے حقوق کے تصور سے خالی ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کو محض انسانی حقوق کے ذریعے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے بالکل نئے انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ہارورڈ یونی ورسٹی کے مشہور فلسفی جان راولز (John Rawls) کی معرکہ آرا کتاب A Theory of Justice نے گذشتہ ۳۰ سال میں انصاف کے مسئلے پر مغرب کے سوچنے کے انداز کو متاثر کیا ہے' اس نے اپنی کتاب میں' جو ابھی شائع ہوئی ہے' لبرلزم کے ساتھ لبرل امپریلزم کے خدوخال بھی نمایاں کیے ہیں۔ اس نے عالمی نظام اور اس کے شریک ممالک اور ایک ملک کے اندر پائے جانے والے دینی' تہذیبی' نسلی اور لسانی گروہوں کے بارے میں جس منصفانہ نظام کا نقشہ پیش کیا ہے وہ کثیر قومی ہیئت (pluralism) ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سیاسی وحدت کے تصور کا محل قوم کی جگہ انسانی گروہ کو قرار دیا جائے تو زیادہ حقیقت پسند اور منصفانہ نظام وجود میں آ سکتا ہے۔

سیاسی فکر کے یہ تمام رجحانات ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونے چاہییں جو کنویں کے مینڈک کی طرح لبرل جمہوریت اور مساوات کے نام پر مخلوط انتخاب کی دہائی دے رہے ہیں اور محض تنگ نظری اور ضد میں جداگانہ انتخاب پر غیر جمہوری اور مبنی بر تفریق و امتیاز ہونے کی تہمت لگا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کا رویہ دلیل اور تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا اور محض تعصب کی عینک سے وہ ایک معقول اور انصاف اور حقیقت پر مبنی نظام کی مخالفت کر رہے ہیں۔

آخر میں ہم یہ بات بھی کہنا چاہتے ہیں جس پلورلزم کی ہم بات کر رہے ہیں اور جس کے لیے جداگانہ انتخاب ایک اہم ذریعہ ہے' اس کے حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ متناسب نمایندگی کا نظام بھی ہے جس میں پارلیمنٹ میں ہر مکتب فکر کی نمایندگی اس کی زمینی اور حقیقی قوت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ متناسب نمایندگی کے نظام میں پاکستان کے حالات کی روشنی میں دیگر بہت سے فوائد بھی ہیں جنھیں ہم اپنی کتاب Proportional Representation and the Revival of Democratic Process in Pakistan (متناسب نمایندگی اور پاکستان میں جمہوری عمل کا احیا) میں پیش کر چکے ہیں۔ متناسب نمایندگی کے نظام کے ذریعے ساری خرابیوں کی اصلاح ممکن نہیں لیکن موجودہ نظام کی بہت سی خرابیاں ضرور اس سے دور ہو سکتی ہیں اور عوامی اداروں میں بہتر نمایندوں کے آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے نظام کو مستحکم کرنے میں بھی اس سے مدد مل سکتی ہے۔ البتہ سیاسی جماعتوں کے لیے خود کو زیادہ جمہوری بنیادوں پر منظم کرنا' اپنی کارکردگی میں زیادہ شفافیت (transparency) پیدا کرنا اور عوام اور عدالتوں کے سامنے جواب دہی میں اضافہ بھی ضروری ہوگا۔ جمہوریت کے فروغ اور ارتقا کے لیے نظام انتخاب کی اصلاح بے حد ضروری ہے۔ ان تمام امور کو پاکستان کے حالات اور ضروریات اور اسلام اور معروف جمہوری اصولوں کی روشنی میں جلد از جلد طے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قوم عملی تبدیلیوں کی طرف پیش قدمی کرے۔

اس تحریر کے کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ مکمل تحریر کا کتابچہ دستیاب ہے: منشورات' منصورہ' لاہور

اشارات کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے: www.jamaat.org

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت معاویہ بن حکم سلمیؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میری ایک لونڈی ہے جو بکریاں چراتی ہے۔ میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ ایک بکری نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بکری کیا ہوئی تو اس نے جواب دیا: اسے بھیڑیا کھا گیا ہے۔ (ایسے موقع پر) انسان غم و غصہ کا شکار ہو جاتا ہے' مجھے بھی لونڈی پر غصہ آگیا' میں نے اس کے چہرے پر ایک طمانچہ مار دیا (بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا' اس لیے جناب کی خدمت میں حاضر ہوں)۔ آپؐ نے اسے بڑی زیادتی قرار دیا۔ اس پر میں نے (زیادتی کے ازالے کے لیے) عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میرے ذمے کفارے میں ایک مومن غلام / مومنہ لونڈی آزاد کرنا ہے' کیا میں اسی لونڈی کو اس کفارے میں آزاد نہ کر دوں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی سے مومن ہونے کا اقرار لینے کے لیے سوال کیا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: آسمان میں' دوسرا سوال کیا: میں کون ہوں' اس نے جواب دیا: آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ نے اس کے جواب کو سن کر فرمایا: اسے آزاد کر دو' یہ مومنہ ہے **(ابوداود' مسلم)**۔

بکری کو بھیڑیا کھا گیا' اس میں لونڈی کا کیا قصور ہے۔ کیا وہ بھیڑیے کا مقابلہ کر سکتی تھی؟ معاشرے میں ماتحتوں اور زیردستوں سے کوشش اور احتیاط کے باوجود نقصان ہو جاتا ہے' ایسی صورت میں وہ اکثر گالی گلوچ' طعن و تشنیع' مار دھاڑ اور توہین و تذلیل کا نشانہ بنتے ہیں۔ بیویاں شوہروں کا' گھریلو ملازم اور ملازمائیں مالکوں کا' ملازم افسروں کا' اور مزارع زمینداروں کا نشانہ بنتے ہیں۔ ظالم ظلم کرنے کے اور مظلوم ظلم برداشت کرنے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ نہ ضمیر کی خلش ہوتی ہے' نہ احتجاج ہوتا ہے۔ اگر کبھی کبھار کا معاملہ ہو' احساس بیدار ہو تو تلافی کی فکر ہوتی ہے' ورنہ اس میں بھی جھوٹی عزت نفس آڑے آجاتی ہے۔

کتنے ہیں جو معاویہ بن حکم سلمیؓ کی طرح اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس کریں' اس کے ازالے کی کوشش کریں اور اپنا حساب و کتاب اس دنیا میں ہی بے باق کرلیں۔ ایک تھپڑ' ایک گالی کو معمولی نہ سمجھیں۔ کسی انسان کے

ساتھ ظلم وزیادتی کو معمولی سمجھ کر انسان مظلوم کا نہیں' اپنا نقصان کرتا ہے۔ معاشرے میں یہ احساس بیدار ہو جائے تو پھر مار دھاڑ کے بجائے شفقت و محبت کا دور دورہ ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور بڑے کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے (مشکوٰۃ شریف)۔

○

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر اپنے عاملوں کے بارے میں خطبہ میں ارشاد فرمایا: لوگو! میں نے اس مقصد کے لیے عامل نہیں بھیجے کہ تمھارے جسموں پر کوڑے ماریں اور تمھارے مال چھین لیں۔ جس کسی کے ساتھ اس طرح کا سلوک ہو تو وہ اپنا معاملہ مجھ تک پہنچائے' میں اسے قصاص دلواؤں گا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ (مصر کے گورنر) نے کہا کہ اگر کوئی شخص رعیت کے کسی آدمی کو تادیبی طور پر مارتا ہے تو آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں! اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' میں اسے قصاص دلواؤں گا۔ میں نے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپؐ نے اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کیا (ابوداؤد)۔

ہمارے معاشرے میں ظلم اتنا بڑھ چکا ہے' اتنا معمول بن گیا ہے کہ انصاف کی بات کو ذہن قبول نہیں کرتے' عجیب لگتی ہے۔ پولیس کے عام سپاہی سے لے کر اعلیٰ افسر تک "کار سرکار" قرار دے کر ہر ناروا کارروائی کرتے ہیں' تعذیب دے کر جان تک لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ عزت و آبرو کی کوئی حیثیت نہیں' دوسرے کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن ہمارا نظام ان ظالموں کی گرفت نہیں کرتا' کوئی سزا نہیں دیتا۔ ہم نے ابھی ربیع الاول میں سیرت رسولؐ کا بہت پرچار کیا' اگر حضرت عمرؓ کی طرح ہم آپؐ کے صرف قصاص کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کریں' صرف ذاتی اور نجی زندگی میں نہیں بلکہ سرکاری پالیسی بنائیں' ہر زیادتی کرنے والے کو معلوم ہو کہ اس سے قصاص لیا جائے گا تو "تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے" کی تعبیر نظر آجائے۔ مظلوم کو بھی معلوم ہو کہ پوری سرکاری مشینری قصاص دلوانے میں اس کی ساتھی ہوگی۔ اللہ کا نبیؐ اپنے کو قصاص کے لیے پیش کر سکتا ہے تو کسی ڈی سی یا آئی جی کو اس میں کیا عار ہے؟ ہماری عدالتیں کچھ افسروں سے قصاص دلوا دیں تو گڈ گورننس کا آغاز ہو جائے۔ معاشرہ امن و سکون سے اس لیے محروم ہے کہ اجتماعی نظام ظالموں کی گرفت کرنے کے بجائے ان کا تحفظ کرتا ہے۔ ہمارے عمال کو اپنے نبی کی اس دعا کو اپنا رہنما بنانا چاہیے: "اے اللہ' جسے میری امت کا کوئی کام سپرد ہو اور وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آئے تو تُو اس پر سختی فرما اور جسے میری امت کا کوئی کام سپرد ہو اور وہ ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئے تو تُو اُس کے ساتھ نرمی فرما"۔

○

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں مہاجرین کی ایک ایسی جماعت کے حلقے

میں بیٹھا تھا جن کی مالی حالت کمزور تھی اور ان میں سے بعض کے پاس اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ ستر عورت کر سکتے۔ وہ ایک دوسرے کے جسم کو اپنے لیے ساتر بناتے تھے۔ ایک شخص قرآن پاک پڑھ رہا تھا اور سب سن رہے تھے۔ اس دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھڑے ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تو قاری خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے حلقے پر سلام کیا اور پوچھا: آپ لوگ کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے قاری قرآن پڑھ رہے تھے اور ہم کتاب اللہ کو سن رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں ان کی معیت اختیار کروں۔ یہ فرما کر آپؐ ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے تاکہ آپؐ اپنی ذات اقدس کو ہماری مجلس میں برابر کا شریک کر دیں۔ پھر آپؐ نے ہاتھ مبارک کے اشارے سے حلقے کو درست کرنے کی طرف اشارہ فرمایا، جس کے نتیجے میں تمام لوگوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ میں وہ واحد خوش قسمت تھا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: اے ہجرت کرنے والے فقیرو! خوش خبری قبول کرو کہ قیامت کے روز تمھیں "نور تام" نصیب ہو گا۔ تم مال داروں سے آدھا دن قبل جنت میں داخل ہو گے۔ آدھا دن پانچ سو سال کا ہو گا (ترمذی، ابوداود)۔

اسلامی روایت میں فقر کی بڑی اہمیت ہے۔ جدید دور میں معاشی خوش حالی قبلہ و کعبہ بن گئی ہے۔ اسلامی فکر میں معاشی خوش حالی ممنوع نہیں لیکن اسے نصب العین، اور زندگی کا مطلوب و مقصود بنا لینا بھی روا نہیں۔ قناعت اور شکر ہمارے دو ایسے تصورات ہیں جن سے مغربی دنیا واقف نہیں۔ اجتماعی زندگی میں ان کی عملی اہمیت پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

ایسے لوگ جو علم دین کے حصول میں، قرآن کے ذکر میں اس طرح مشغول ہوں کہ عرف عام میں انھیں اپنی دنیا کی بالکل فکر نہ ہو، اس حد تک کہ لباس تک مناسب نہ ہو، ہم لوگ معلوم نہیں ایسے لوگوں کو کیا سمجھیں اور مشورہ دیں، اللہ کے رسولؐ نے تو انھیں مال داروں سے پانچ سو سال قبل جنت میں جانے کی خوش خبری دی اور خود ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

○

حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: تین دن ہو گئے ہیں پیٹ میں کوئی ایسی چیز نہیں گئی جو کسی ذی روح کے پیٹ میں جاتی ہے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں،

یہ سن کر میں واپس آگیا۔ ایک یہودی کے باغ میں گیا۔ دیکھا کہ وہ اپنے اونٹوں کو پانی پلانے کے لیے کنویں سے پانی نکال رہا ہے۔ میں نے اس سے ایک ڈول کے عوض ایک کھجور کی اجرت طے کر کے ڈول نکالنے کا سودا طے کیا۔ اس کی ضرورت کے مطابق ڈول نکالے اور اس کے عوض جتنی کھجوریں بنیں وہ حاصل کیں۔ لے کر حضورؐ کے پاس پہنچا اور کھجوریں پیش کیں۔ آپؐ نے پوچھا: کعب کہاں سے لائے ہو؟ میں نے قصہ بیان کیا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا: کعب! مجھ سے محبت کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں یارسولؐ اللہ، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں! آپؐ نے فرمایا: جو آدمی مجھ سے محبت کرتا ہے فقر و فاقہ اس کی طرف اس سیلاب سے بھی زیادہ تیزی سے پہنچتا ہے جو طوفانی رفتار سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ تم پر بھی آزمایش آئے گی، اس کے لیے ڈھال تیار رکھو۔

اس کے بعد ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کعب نظر نہیں آ رہے۔ پوچھا: کعب کہاں ہیں؟ صحابہؓ نے جواب دیا: بیمار ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر پیدل چل کر پہنچے، گھر میں داخل ہوئے، فرمایا: کعب خوش خبری قبول کرو۔ کعب کی ماں نے کہا: کعب تجھے جنت مبارک ہو! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ کے بارے میں قسم اٹھانے والی کون ہے؟ (یعنی جنت کی مبارک باد دینے کے معنی تو یہ ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سنا رہی ہیں کہ اللہ نے اس کے جنتی ہونے کا فیصلہ فرما دیا ہے اور اس بات کو اس قدر یقین سے بیان کر رہی ہیں جس طرح وہ بات یقینی ہوتی ہے جس کی آدمی قسم اٹھاتا ہے)۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میری ماں ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: کعب کی ماں! تمھیں کیا معلوم! ہو سکتا ہے کہ کعب نے ایسی بات زبان سے نکالی ہو جو اس کے لیے نافع نہ ہو اور ایسی چیز دینے سے انکار کیا ہو جس کی اس کو ضرورت نہ تھی (الترغیب والترہیب ۵/ ۱۵۳، مجمع الزوائد ۱۰/ ۳۱۴)۔

فقر و فاقہ کی تلقین کرنا آسان لیکن نمونہ پیش کرنا، عمل کرنا اور اس سے گزرنا اصل کام ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی جو تصویر اس حدیث میں سامنے آتی ہے، سیرت رسولؐ بیان کرنے والوں اور عام کھاتے پیتے مسلمانوں سب کو اس سے بڑا سبق ملتا ہے۔ آپؐ چاہتے تو کیا دنیاوی آسایشیں فراہم نہ ہو سکتی تھیں؟ لیکن آپؐ نے آخرت کو پسند کیا۔

ہماری نظروں میں قرآن و سنت کی رو سے تو سب صحابہ کرامؓ جنتی ہیں۔ ان کے پاس ایمان و عمل اور محبت و خدمت رسولؐ کا ایسا عظیم سرمایہ ہے، لیکن حساب کتاب اور جنت میں داخلہ اتنا سخت معاملہ ہے کہ اپنے طور پر اس دنیا میں پہلے سے فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت کعب کی والدہ کو جن دو امور کی وجہ سے بیٹے کو جنت کی بشارت دینے پر ٹوک رہے ہیں، وہ دو باتیں کیا ہیں؟ لایعنی بات اور زائد از ضرورت چیز حاجت مند کو نہ دینا ----- ان دو معیارات پر ہم اپنا جائزہ تو لیں۔

عہد حاضر میں

مسلمان عورت کو درپیش مسائل اور ان کا حل

سید جلال الدین عمری ○

مغرب نے جو مسائل پیدا کیے ہیں ان میں بنیادی مسئلہ اس کے فلسفہ حیات کا ہے۔ اس کا حملہ اتنا زبردست اور اس کا دباؤ اتنا شدید ہے کہ مسلمان عورت کو استقلال اور استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ قدم قدم پر محسوس کرتی ہے کہ یہ پورا فلسفہ اس کی راہ میں مزاحم ہی نہیں بلکہ اسے ایک دوسری ہی سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ اس میں خدا پر ایمان و یقین' اس کی عبادت و اطاعت' رسولؐ کی رسالت' اس کی ہدایت اور رہنمائی اور آخرت کی بازپرس کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ وہ دین کی ان بنیادی حقیقتوں کا انکار کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور ان سے آزاد ہو کر زندگی کی تعمیر چاہتا ہے۔ یہ ایک زبردست ذہنی کش مکش ہے جس سے مسلمان عورت دوچار ہے (یہ کش مکش مسلمان مرد کے لیے بھی ہے۔ یہاں زیر بحث مسلمان عورت کے مسائل ہیں' اس لیے صرف اسی کا ذکر ہے)۔

دین دار عورت کے مسائل اور مشکلات

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمان عورت گھر اور خاندان کو اپنا اصل مرکز توجہ اور حقیقی دائرہ کار سمجھتی ہے۔ مغربی تہذیب اسے اس مرکز سے ہٹانے کی بھرپور کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ وہ گھر میں گھس کر اس کے سکون پر حملہ آور ہو رہی ہے اور اسے بے یقینی اور اضطراب میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔ مغرب جن پہلوؤں سے اسلام پر اپنی یورش جاری رکھے ہوئے ہے ان میں اس کے نظام خاندان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

○ مدیر سہ ماہی تحقیقات اسلامی' علی گڑھ (بھارت)

وہ مختلف عنوانات سے یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اسلامی خاندان عورت کے لیے ایک قیدخانہ سے کم نہیں ہے، اس کی بنیاد مرد کے اقتدار پر ہے۔ اس میں عورت کی حیثیت ایک محکوم سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے حقوق غیر محفوظ اور اس کی ذمہ داریاں بے شمار ہیں۔ پردے کے نام سے اس کی آزادانہ تگ و دو پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ وہ کھل کر کسی معاملے میں کسی کے سامنے نہیں آسکتی۔ وہ پیدائش سے لے کر شادی تک ماں باپ کی دست نگر اور شادی کے بعد شوہر کی باندی ہے۔ مرد اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے چار بیویاں رکھ سکتا ہے اور طلاق کے دو لفظ بول کر ان میں سے جسے چاہے گھر سے نکال سکتا ہے۔ اس کی معاش کا کوئی نظم نہیں ہے اور وہ مرد کے ہاتھ میں مجبور و محبوس ہے۔

اسلام کی تعلیم کی یہ بہت ہی غلط تعبیر ہے۔ دنیا کی کسی بھی صحیح اور معقول بات کو نامعقول اور بھیانک بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے، یہ اسی طرح کی کوشش ہے۔ اس کوشش کو ناکام بنانا اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

خاندانی نظام پر اس فکری یلغار یا لگاتار حملوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عورت اس نظام ہی سے متنفر ہو جائے، اسے ایک ظالمانہ نظام سمجھے اور اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ وہ آگے بڑھ کر ماں باپ سے، شوہر سے اور پورے خاندان سے بغاوت کر دے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی بغاوت کے بعد خاندان اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا اور اسے شکست و ریخت سے کوئی طاقت بچا نہیں سکتی۔ خاندان، معاشرے کا بنیادی ادارہ ہے۔ اسلام آج بھی یہاں بڑی حد تک زندہ اور محفوظ ہے۔ اگر یہ ادارہ ختم ہو جائے تو اجتماعی زندگی کے دوسرے اداروں سے وہ آسانی سے ختم ہو جائے گا۔ مغربی تہذیب یہی چاہتی ہے۔

مغرب میں عورت اور مرد کی مساوات کا ایک خاص تصور پایا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر فطری تصور ہے۔ اسی وجہ سے خود مغرب میں اسے پوری طرح اپنایا نہیں جا سکا ہے۔ عورت اور مرد کی صلاحیتوں کا فرق اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن اس تصور کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ہر تنقید سے بالاتر ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت بھی مشکل ہی سے کی جاتی ہے۔

مساوات کے اس تصور کے تحت مسلمان عورت کو یہ باور کرانے کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے کہ خاندان ہی میں نہیں، اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اسے مرد کے مساوی درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہیں جو بہ حیثیت ایک انسان کسی مہذب معاشرے میں ملنے چاہییں۔ اسے مرد سے کم تر سمجھا جاتا ہے، اس کی شہادت آدھی شہادت ہے، اس کی دیت نصف دیت ہے، وراثت میں اس کا حصہ آدھا ہے۔ ملازمت، تجارت اور صنعت و حرفت میں اس کا کوئی عمل

دخل نہیں ہے۔ حکمرانی کے منصب پر وہ کبھی فائز نہیں ہو سکتی۔ مسلمان عورت کی مظلومیت کی یہ داستان دور جدید کے طاقت ور ذرائع ابلاغ سے اس زور شور سے سنائی جا رہی ہے کہ دل و دماغ کا اس سے متاثر و مرعوب ہونا تعجب خیز نہیں ہے، جب کہ اسلام کا موقف اتنی ہی قوت کے ساتھ سامنے نہیں آ رہا ہے اور ماحول بھی اس کے مخالف ہے۔

مسلمان عورت عملی کش مکش میں بھی مبتلا ہے۔ ایک طرف اس کے خیالات زمانے کے خیالات سے متصادم، اس کے سوچنے کا انداز معاصر فکر سے مختلف، اس کے ذوق اور دلچسپی کا دائرہ آج کی دنیا کے تفریح سے جدا اور دوسری طرف اس کا صوم و صلوٰۃ اور عبادات کا پابند ہونا، اخلاقی اقدار پر اس کا اصرار، موجودہ عریاں کلچر اور آرٹ سے اس کی دوری، شرم و حیا کو اس کا زینت سمجھنا، اس کا لباس اور اس کا حجاب، یہ سب چیزیں آج کے ماحول میں اسے بالکل اجنبی بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ یوں محسوس کرتی ہے جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو اور دین و اخلاق کی صاف ستھری فضا میں وہ سانس لینا چاہے تو بھی نہ لے پا رہی ہو۔ اگر اتفاق سے، اور اب یہ محض اتفاق ہی نہیں رہا بلکہ ایک عمومی واقعہ بن گیا ہے، ماں، باپ، شوہر یا خاندان کے دوسرے افراد غیر اسلامی ذہن و مزاج کے ہوں تو مسلمان عورت کی کش مکش اپنے گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کش مکش بڑی سخت ہوتی ہے۔ اپنے قریبی ماحول کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اسے بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ حالات میں ایک مسلمان خاتون جن مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا ہے۔ آج علم محض چند طبعی یا فکری معلومات میں اضافے کا نام ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے طالب علم کو ادبی، سماجی اور سائنسی معلومات تو فراہم کرتے ہیں لیکن ان معلومات کو صحیح رخ نہیں دے پاتے۔ اس لیے طالب علم کی ذہنی و فکری تربیت نہیں ہوتی اور معلومات کا یہ بوجھ کبھی کبھی دین سے انحراف کا سبب بن جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں سے باہر کی دنیا اخلاقی بگاڑ ہی میں اضافہ کرتی ہے۔ بسا اوقات گھر کا ماحول بھی اصلاح و تربیت میں معاون نہیں ہوتا۔ ان حالات میں اسلامی ذہن و فکر رکھنے والی خاتون جب دیکھتی ہے کہ نئی نسل جس میں اس کی اولاد بھی شامل ہے غیر اسلامی افکار کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے اور اسے وہ روک نہیں پا رہی ہے تو اسے دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی اس پریشانی اور فکرمندی کا تصور کرنا دشوار نہیں ہے۔

یہ تو بعض مسائل اور دشواریاں ہیں۔ مخالف ماحول میں اس طرح کی دشواریوں کا پیش آنا تعجب خیز نہیں ہے، ان کا پیش نہ آنا تعجب کا باعث ہو سکتا ہے۔ ان سے ہراساں ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان خاتون اپنے دین و ایمان، خدا سے تعلق اور استعانت اور حکمت و تدبیر سے ان پر قابو پا سکتی ہے۔

اگر وہ اس فیصلے اور عزم و یقین کے ساتھ کھڑی ہو کہ حق پر قائم رہے گی اور غیر اسلامی ماحول کو بدلنے کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں گی انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرے گی تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اسے حاصل ہو گی، رکاوٹیں دور ہوں گی، ظلمت شب چھٹے گی اور کامیابی کی سحر طلوع ہو گی۔

مسلم معاشرے میں عورت کی حیثیت

موجودہ مسلم معاشرے میں (خاص طور پر برعظیم کے پس منظر میں) عورت کی حالت بڑی ابتر رہی ہے۔ وہ ان حقوق سے بڑی حد تک محروم تھی اور ہے جو اسلام نے اسے عطا کیے ہیں۔ دور جاہلیت کی طرح لڑکی کو ایک بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش پر خوشی نہیں محسوس کی جاتی بلکہ ماں باپ اور گھر کے لوگوں پر ایک طرح کی افسردگی چھا جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف وہ توجہ نہیں کی جاتی جو لڑکوں کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ اس کی تعلیم صحیح معنی میں نہ قدیم ہوتی ہے اور نہ جدید۔ اس کی معلومات کی دنیا خاندان کے طور طریقوں اور رسوم و رواج تک محدود ہوتی ہے۔ اس کی واقفیت نہ تو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے ہوتی ہے اور نہ جدید علوم سے۔ زندگی کے کسی شعبے میں اسے وہ بصیرت حاصل نہیں ہوتی کہ دینی اور دنیوی نقطہ نظر سے صحیح اور غلط کاموں کا فیصلہ کر سکے۔ قومی اور بین الاقوامی معاملات سے وہ بے خبر ہوتی ہے۔ دنیا میں کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں؟ کیوں آ رہی ہیں؟ اور ان کے پیچھے کیا اسباب و عوامل ہیں؟ ان کا اسے کوئی علم نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے بھلے برے سے کٹ کر رہ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس صورت حال میں کہیں کہیں تبدیلی ضرور آئی ہے اور ہماری خواتین نے علم کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن ایک طویل عرصے سے وہ تعلیم میں اس قدر پیچھے رہی ہیں کہ اس کی تلافی کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہو گی۔

اب تعلیم سے ہٹ کر بعض دوسرے معاملات پر غور فرمایئے۔ شادی کے وقت مہر کی بڑی مقدار طے ہوتی ہے لیکن اس کے ادا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ شادی کے بعد اس کی ذمہ داریاں تو بیان ہوتی رہتی ہیں، ان میں وہ ذمہ داریاں بھی شامل ہیں جن کا ازروے شرع کوئی جواز نہیں ہے لیکن اس کے حقوق کا ذکر شاذ ہی ہوتا ہے۔ شریعت کا منشا یہ ہے کہ عورت پر خانگی امور اور اس کے نظم و نسق کا بوجھ جس میں کھانا پکانا صفائی ستھرائی وغیرہ شامل ہے، اس کی طاقت سے زیادہ نہ ڈالا جائے۔ اگر یہ بوجھ زیادہ ہو تو مرد اس میں تعاون کرے۔ لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ اس بوجھ کے ساتھ خاوند کی خدمت بھی اسے کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ خاوند کے بھائیوں، بہنوں اور دور و نزدیک کے رشتے داروں کی خدمت بھی اس پر لازم سمجھی جاتی ہے۔ اس میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کی جاتی اور اس پر طرح طرح کی زیادتیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کی عمر کا بہترین حصہ ساس بہو کے جھگڑوں اور سسرال کے غلط سلوک کی نذر ہو جاتا

ہے۔ ماحول کی سختی کی وجہ سے اس کی قوت و توانائی ضائع ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ خاندان اور سماج کے لیے مفید خدمت انجام نہیں دے پاتی۔ منقولہ اور غیر منقولہ جایداد میں اسے وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ بیوہ یا مطلقہ ہو جانے پر اس کا دوبارہ نکاح ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی پوری عمر بے شوہر کے گزر جاتی ہے۔

ان حالات میں مسلمان عورت کے اندر ایک طرح کی مایوسی کا پایا جانا فطری ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اسے نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ کمزوری اور مجبوری کی وجہ سے اس کا استحصال ہو رہا ہے۔ اس کے دینی اور سماجی فرائض اور ذمہ داریوں کا تو ہر طرف چرچا ہے اور ان کے پورے کیے جانے کا مطالبہ بھی شدت سے ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے حقوق ادا کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ احساس عملاً اسے آہستہ آہستہ اسلام سے دور کر رہا ہے۔ اس کے اندر اسلام سے نظریاتی یا فکری بغاوت تو بالعموم نہیں ہے لیکن اسلام سے جس قسم کا تعلق اور وابستگی ہونی چاہیے وہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اسے اسلامی معاشرے میں وہ کشش نظر نہیں آتی جو اس سے جڑے رہنے اور اسے مستحکم بنانے کے لیے ضروری ہے۔

تحریکات اسلامی کی اصلاحی کوششیں

اسلامی تحریکوں نے اس صورت حال کو بدلنے کی مختلف پہلوؤں سے جو کوشش کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس کے نتیجے میں جہاں تک ان تحریکوں کے اثرات ہیں، ایک طرف تو مسلمان عورت کو اس کے اسلامی حقوق مل رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان خواتین کے ایک طبقے میں دین کا صحیح شعور پیدا ہو رہا ہے۔ ان میں سے بعض اسلامی جذبات سے سرشار ہیں اور حالات کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے اثرات بہت محدود ہیں۔ معاشرے میں اس سے کوئی بڑی محسوس تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی مسلمان عورت اسلام کی واضح تعلیمات سے متصادم اور مخالف ماحول میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے معاشرے کی فضا بدلے، عورت دین اور دنیا کے علم سے آراستہ ہو، اپنے حقوق اور فرائض کو پہچانے، اسلامی تعلیمات کی پابند ہو، اس کے جو حقوق مجروح ہو رہے ہوں، انھیں اسلام کی بیان کردہ حدود کے اندر حاصل کرنے کی جدوجہد کرے اور اپنے فرائض سے غفلت نہ برتے بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں ادا کرنے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف مرد کو اپنے رویے پر نظرثانی کرنی ہو گی۔ وہ خوش دلی سے عورت کے حقوق ادا کرے، جس پہلو سے بھی اس پر زیادتی ہو رہی ہو، اسے دور کرنے میں کوتاہی نہ کرے اور اسے بہتر، باوقار اور پُرسکون ماحول فراہم کرے۔

معاشرے کی اصلاح اور اس کے اندر اسلامی فضا پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اسے بڑی حکمت اور

دانائی کے ساتھ انجام دینا ہو گا۔ عورت کے اندر بغاوت کا اور مرد کے اندر اسے دبانے اور کچلنے کا جذبہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے ورنہ خاندان کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ دونوں طرف قانونی جنگ کی جگہ محبت اور الفت کی وہ فضا ہونی چاہیے جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ اس سے ایک اسلامی معاشرے کی تعمیر ممکن ہو گی۔

جب اسلام غالب ہو گا

اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش کا یہ دور ختم ہونے کے بعد مسلمان عورت' یقین ہے کہ ایک نئی زندگی اور نئی توانائی کے ساتھ میدان عمل میں آئے گی۔ اس کے چند نمایاں پہلو یہ ہوں گے:

غیر اسلامی افکار و نظریات اس کے لیے اپنی کشش کھو دیں گے۔ ان کے جھوٹے پروپیگنڈے اور کھوکھلے نعروں کی تاثیر ختم ہو جائے گی۔ مسلمان عورت اسلامی فکر کی علم بردار' اسلامی سیرت کی حامل اور اسلامی حدود و آداب کی پابند ہو گی۔ اس کی پوری زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے گی۔

وہ علم کی دولت سے آراستہ' دنیاوی مسائل سے واقف اور دینی بصیرت کی حامل ہو گی' اس وجہ سے اسے کسی اضطراب میں مبتلا کرنا اور دین سے متنفر کرنا آسان نہ ہو گا۔

اسلام نے اسے جو حقوق دیے ہیں' چاہے ان کا تعلق عائلی زندگی سے ہو یا سیاسی' سماجی اور معاشی زندگی سے' وہ ان سب سے بہرہ ور ہو گی اور اس احساس سے دوچار نہ ہو گی کہ اسلامی معاشرے میں بھی اسے ان سب کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسے وہ ان کا محافظ پائے گی' موجودہ دور کے پُرفریب تصور مساوات کی جگہ حقیقی مساوات سے روشناس ہو گی۔

مسلمان عورت کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا بھی احساس ہو گا۔ وہ خانگی ذمہ داریوں کو حقیر نہیں سمجھے گی بلکہ معاشرے کی تعمیر میں خاندان کی جو اہمیت ہے اسے وہ اہمیت دے گی۔ اسے اسلام کا مضبوط قلعہ بنانے میں شوہر کی معاون ہو گی اور آنے والی نسل کو اسلامی سیرت و کردار میں ڈھالنے کی کوشش کرے گی۔

مسلمان عورت کا ملکی و ملی مسائل سے مضبوط تعلق ہو گا۔ وہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے فکر مند ہو گی اور اس کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرے گی۔ اجتماعی زندگی میں موثر کردار ادا کرے گی' رائے' مشورہ اور نقد و احتساب میں شریک ہو گی اور جہاں کوئی خامی دیکھے گی اس کی اصلاح کی کوشش کرے گی۔

بعض توجہ طلب پہلو

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی تحریکوں میں مسلمان خواتین کا جو حصہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ حالانکہ

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری مرد اور عورت دونوں پر ڈالی گئی ہے۔ یہ اسلام کا دعوتی مقصد بھی ہے اور سیاسی بھی۔ اسلام جس معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے اس کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ دونوں معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے میں نہ لگ جائیں۔ قرآن مجید اس پاک مقصد کے لیے دونوں کے باہم تعاون کو ضروری قرار دیتا ہے۔ یہی حقیقت سورہ توبہ کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

> ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ (۹:۷۱)

دور اول کی تاریخ ہمارے سامنے ہے' اللہ کے دین کو قبول کرنے' اس کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے اور ہجرت و جہاد اور اسلامی ریاست کے قیام کے مختلف مراحل میں عورت مردوں کے دوش بدوش رہی۔ یہی کردار آج مسلمان عورت کو ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کار دعوت کی اہمیت اس کے ذہن نشین کرائی جائے' اس راہ میں قربانی کا جذبہ اس کے اندر پیدا کیا جائے۔ اسے بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کا ایک بنیادی تقاضا امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی ہے۔ اس کی تکمیل مرد اور عورت کے باہم تعاون ہی سے ہو سکتی ہے۔ معروف کے مٹنے اور منکر کے پھیلنے پر جو بے چینی ایک دین دار مرد میں ہونی چاہیے وہی ایک دین دار عورت میں ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ شرعی حدود کے اندر اسے ان تمام کاموں میں عملاً شریک کیا جائے جو اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔

ربیع الاول کا مہینہ گزرا ---
رسولؐ اور سیرت رسولؐ کا بہت تذکرہ ہوا۔
آیئے ایک بات سوچیں! (سوچنا تو منع نہیں ہے)

فرض کیجیے معلوم ہو کہ رسول اللہؐ پاکستان کے دورے پر تشریف لا رہے ہیں!
فہرست بنایئے کہ ان کی مرضی اور تعلیمات کے خلاف کیا کیا امور ہیں جن کو چھوڑنا
اور جن کے آثار مٹانا ہوں گے

مزید فرض کیجیے کہ اس دورے کے دوران آپ کی خوش نصیبی کہ وہ آپ کے گھر بھی
تشریف لائیں گے!
ان کے استقبال کے لیے آپ کو کیا کیا تبدیلیاں لانا ہوں گی
آپ خوب جانتے ہیں کہ ان کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند
مہمان کی تکریم کے لیے' ان کی خوشی کے لیے آپ کیا کیا کریں گے

آخر ایک دن ہمارا اپنے پیارے رسولؐ سے سامنا ہوگا
(جنھوں نے ہم تک اللہ کا دین پہنچانے کے لیے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کیں)
کیا ہم اس دن شرمندہ ہونا پسند کریں گے؟
کیوں نہ اس دن ہمارا سر اٹھا ہوا ہو!

(خیر خواہ)

شرکت اقتدار اور اسلامی تحریک

اخوان المسلمون اردن کے تجربات: ایک مطالعہ

ڈاکٹر عزام تمیمی ٥ / محمد ایوب منیر

زمانۂ قدیم سے دریائے اردن کے مشرقی کنارے کی سرزمین' مغربی کنارے سے سیاسی اور ثقافتی طور پر منسلک چلی آ رہی ہے۔ یہ خطہ اسلامی قلمرو کا حصہ رہا۔ بعدازاں ساتویں صدی میں یہ رومی سلطنت کے زیر نگیں آ گیا۔ خلافت عثمانیہ نے سولھویں صدی میں یہاں اقتدار حاصل کیا جو ۱۹۲۰ء تک برقرار رہا۔ اس کے بعد دریا کے دونوں کنارے برطانیہ کے زیر تسلط آ گئے۔

دریا کے مشرقی کنارے پر ۱۹۲۱ء میں شرق اردن کی امارت قائم ہوئی۔ حکومت انگلستان نے والی حجاز کے بیٹے' شہزادہ عبداللہ کو اس خودمختار ریاست شرق اردن کا امیر متعین کر دیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو لندن میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے اور برطانیہ نے اس علاقے کو ایک خودمختار ریاست تسلیم کر لیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۴۶ء کو امیر عبداللہ نے شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ۱۷ جون ۱۹۴۶ء کو معاہدے کی توثیق ہوئی اور اس علاقے کو ہاشمی سلطنت اردن کا نام دیا گیا۔

۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد دریائے اردن کے مشرقی اور مغربی کنارے متحد کر دیے گئے تاکہ فلسطین کا وہ علاقہ جو عربوں کے ماتحت تھا' اسرائیلی تسلط سے آزاد رہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس اتحاد کی توثیق ہوئی اور اس کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا۔ ۱۷ برس بعد ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل نے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا۔ ۳۱ جولائی ۱۹۸۸ء کو شاہ حسین نے اعلان کر دیا کہ اسرائیل کے مقبوضہ مغربی کنارے کا قبضہ حاصل کرنے کی کوششیں ہم ترک کر رہے ہیں اور آیندہ تحریک آزادی فلسطین

---

٥ ڈائرکٹر' ادارہ فکر اسلامی' لندن

اس علاقے کی دعوے دار اور حق دار ہو گی۔

اپنے قیام کے بعد سے' اس مملکت پر چار بادشاہ حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ شاہ عبداللہ ابن الحسین (۱۹۲۱-۵۱ء)' شاہ طلال ابن عبداللہ (۱۹۵۱-۵۲ء)' شاہ حسین ابن طلال (۱۹۵۲-۹۹ء) کے بعد موجودہ بادشاہ عبداللہ ابن حسین ہیں۔ موجودہ اردن کی سرحدیں شمال میں مملکت شام' مشرق میں عراق' جنوب مشرق میں سعودی عرب' جنوب میں خلیج عقبہ اور بحراحمر' اور مغرب میں اسرائیل اور مغربی کنارے (دونوں مل کر تاریخی فلسطین) سے ملتی ہیں۔ اس ملک کا مجموعی رقبہ تقریباً ۹۰ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اردن کی سرزمین کا ۸۸ فی صد رقبہ بنجر ہے تاہم اس کی مغربی پٹی کے ساتھ زرخیز رقبے پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۹۹۴ء کی مردم شماری کے مطابق اردن کی آبادی ۴۱ لاکھ تھی۔ اردن کی غالب آبادی اہل سنت مسلمانوں پر مشتمل ہے' جب کہ عیسائیوں کی بھی معقول تعداد (۸ فی صد) آباد ہے۔ عربی سرکاری زبان ہے تاہم انگریزی بھی بولی سمجھی جاتی ہے۔ آبادی کی غالب اکثریت میں ۹۸ فی صد آبادی عرب ہے۔ دو فی صد آبادی کاکیشیا اور چیچن نسلوں پر مشتمل ہے۔

اردن کا دستور ۱۹۴۹ء میں تحریر پایا' ۱۹۵۲ء میں نافذ ہوا اور اس کے بعد اس میں کئی بار ترامیم ہوئیں خصوصاً ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۶ء میں بہت سی ترامیم متعارف کرائی گئیں۔ دستوری طور پر یہ ایک موروثی بادشاہت ہے' جہاں پارلیمانی نظام حکومت ہے۔ دستور میں ریاست کے اختیارات و فرائض' قوانین ریاست کی تنفیذ' ہنگامی اختیارات اور دستوری ترامیم کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ دستور مقننہ' عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ حیثیت عطا کرتا ہے۔[۱]

دستور کی دفعہ ۳۰ کے مطابق' بادشاہ سربراہ ریاست ہے اور تمام ذمہ داری اور جواب دہی سے مبرا ہے۔ دوسری دفعات اسے یہ اختیار عطا کرتی ہیں کہ وہ قوانین میں تبدیلی کر سکے اور ان کی تنفیذ کر سکے' حکومت کو ہدایت جاری کرے کہ ذیلی قوانین اور ضابطے وضع کیے جائیں اور ان کا نفاذ کیا جائے۔ شاہی فرمان کے ذریعے عدالتی اختیارات استعمال کر سکے اور جب وہ مناسب سمجھے ایوان زیریں کا اجلاس بلائے' اس میں وقفہ کرے' اسے معطل کرے' یا اسے تحلیل کر دے۔ شاہ اردن وزیراعظم اور دیگر وزرا کا بھی تقرر کرتا ہے اور انھیں برخواست کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔

دستور کے مطابق قانون سازی کا اختیار شاہ اردن اور پارلیمان کے پاس ہے۔ پارلیمان کا ایک ایوان بالا (سینیٹ) ہے جس کے ارکان کی تعداد ۴۰ ہے اور ان کی نامزدگی شاہ کرتا ہے۔ ایوان زیریں کے ارکان کی تعداد ۸۰ ہوتی ہے جن کا انتخاب بالغ رائے دہی کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ ۱۸ سال سے زائد عمر کے مرد و زن حق رائے دہی استعمال کر سکتے ہیں۔

۵ فروری ۱۹۷۶ء کو پارلیمان کے دونوں ایوانوں نے دستور میں ترامیم کی منظوری دی۔ ان ترامیم کے بعد شاہ کو یہ حق بھی حاصل ہو گیا کہ انتخابات کا انعقاد تااطلاع ثانی ملتوی کر دے۔ نتیجتاً ایوان زیریں ختم کر دیا گیا کیونکہ مغربی کنارے میں انتخابات کا انعقاد ممکن نہ ہو سکا تھا جو ۱۹۶۷ء سے اسرائیلی قبضے میں چلا آ رہا تھا۔ پارلیمان کا اجلاس ۹ جنوری ۱۹۸۴ء کو منعقد ہوا۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں ضمنی انتخابات ہوئے اور چھ ارکان مغربی کنارے کے لیے نامزد کیے گئے اور اس طرح پارلیمان کے ارکان کی تعداد ۶۰ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۸۴ء میں خواتین نے پہلی بار ووٹ ڈالے۔ ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو پھر انتخابات ہوئے۔ پارلیمان کی نشستوں کی تعداد ۸۰ تک پہنچ گئی اور دریاے اردن کے مشرقی کنارے سے نمایندے منتخب کیے گئے۔

اخوان المسلمون اردن

۱۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو اخوان المسلمون کی اردن شاخ کا آغاز ہوا اور عبداللطیف ابو قراء اس کے سربراہ بنے۔ نصب العین اور طریق کار میں اخوان کی مادر تنظیم مصر سے اس کا کوئی اختلاف نہ تھا جس کو ۱۹۲۸ء میں حسن البناؒ نے قائم کیا تھا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ابو قراء کے بجائے عبدالرحمٰن خلیفہ سربراہ بنے جنھوں نے مرکزی ذمہ دار کے لیے المراقب العام (نگران اعلیٰ) کا لفظ متعارف کرایا۔ ۳ اپریل ۱۹۵۴ء کو ایک بیان تحریک کی طرف سے جاری کیا گیا جس میں اہم مسائل پر اخوان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس میں یہ بھی تحریر تھا: "اردن' مسلم دنیا کا ایک ناقابل تقسیم حصہ ہے۔ شریعت کے مطابق حکومت کا قیام اخوان کی خواہش اور منزل ہے۔ فلسطین کا مسئلہ ایک اسلامی مسئلہ ہے اور اس کے لیے تمام مادی اور اخلاقی وسائل بروے کار لائے جائیں تاکہ عالم گیر صیہونیت اور صلیبی حملوں سے اسے آزاد کرایا جاسکے"۔ (۲)

اخوان نے حکومت کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا' وہ اس یقین پر مبنی ہے کہ اندرونی و بیرونی عوامل نے اردن کی آزادی اور خودمختاری کو محدود کر دیا ہے۔ جنگ عظیم اول اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے نتیجے میں قائم ہونے والی اردن کی مملکت نئے عالمی نظام کا حصہ تھی' اس لیے اردن کی حکومت کے سیاسی فیصلوں کا اس نئے نظام سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اردن کو کمزور اور بیرونی امداد کا محتاج رکھا جائے۔ اس حقیقت کا آغاز میں اخوان کو احساس نہ تھا۔ لیکن ۱۹۹۰ء میں وہ کابینہ کا حصہ بنے تو انھیں معلوم ہوا کہ وسائل سے محروم ایک چھوٹے سے ملک کے ان گنت مسائل کے لیے بہت کچھ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس پر بے انتہا قرضے ہیں۔ اپنے قیام ہی سے اردن کے اخوان ہاشمی حکومت کو قانونی حکومت تسلیم کرتے ہیں اور کسی بہتر متبادل کی تلاش میں نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں' حکومت نے ان کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا اور بالخصوص بحرانی حالات میں نظم و ضبط اور امن عامہ کے قیام کے لیے اس پر بھروسا کرنے لگی۔ دوسری طرف مصر' عراق اور شام میں اخوان کے ساتھ وہاں کی حکومتوں نے جو پالیسی اختیار کی

اس کے اثرات یہاں پہنچے' نیز ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں حکومت کے اسرائیل سے ہزیمت اٹھانے کے بھی اثرات ہوئے اور یہاں کے اخوان میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ ان کے رویے میں لچک اور مفاہمت کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ سید قطب ؒ اور ان کے رفقا کی تحریریں بھی اس کا سبب بنیں۔

سید قطب ؒ (۶۶-۱۹۰۶ء) کو ۱۹۵۴ء میں ۱۰ برس قید کی سزا ہوئی اور پھر ۱۹۶۶ء میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔ ۵۰ کے عشرے ہی سے ان کو اخوان المسلمون کا اہم مفکر سمجھا جانے لگا تھا۔ ان کی کتاب معالم فی الطریق [جادہ و منزل' ترجمہ: مولانا خلیل احمد حامدی ؒ] ان کو پھانسی دیے جانے اور ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شکست کے بعد عالم عرب میں بڑے پیمانے پر مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں سید قطب ؒ نے جاہلیت کے تصور پر بحث کی ہے جس سے نجات دلانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ مسلم معاشرہ' سید قطب ؒ کے مطابق' بذات خود دو حصوں میں یعنی اسلام اور جاہلیت میں منقسم ہو کر رہ گیا ہے۔ مولانا مودودی ؒ (۷۹-۱۹۰۳ء) کے اس نظریے سے استدلال کرتے ہوئے کہ اسلام جاہلیت کے دور میں پھر لوٹ آیا ہے اور اسلام کے حقیقی علم بردار اپنے آپ کو مرتدوں کے خلاف حالت جنگ میں پاتے ہیں' سید قطب ؒ نے کہا کہ حقیقی مسلمان جو کہ ہراول دستے کا کردار ادا کر رہے ہیں' ایک لادینی یا ملحد معاشرے سے' ایک متبادل معاشرے کے طور پر الگ ہیں اور انھیں الگ رہنا چاہیے۔ اس طرز فکر کے نتیجے میں سید قطب ؒ نے جمہوریت کے تصور کو رد کر دیا اور اسے اجنبی' ناقابل عمل اور "جاہلیت" قرار دیا۔ مولانا مودودی ؒ کے حاکمیت الٰہیہ کے تصور کو بنیاد بناتے ہوئے انھوں نے جمہوریت کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت کی مخالفت کی۔ ابتدا میں وہ اس بات کے بھی مخالف تھے کہ اسلام کو جمہوری کہا جائے یہاں تک کہ انھوں نے ایک ایسی منصفانہ آمریت کے لیے بھی آواز اٹھائی جو صرف نیک لوگوں کو سیاسی آزادیاں دے دے۔ (۳)

اس نقطۂ نظر کی وجہ سے ۷۰ اور ۸۰ کے عشروں میں انقلابی عناصر کو اخوان کی اکثریت کی حمایت حاصل رہی۔ لیکن جب اخوان نے ۱۹۸۹ء کے پارلیمانی انتخابات میں جوش و خروش سے حصہ لیا' اور اس کے ۲۲ نمایندے اور ۱۰ دوسرے آزاد اسلام پسند افراد ایوان نمایندگان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو اس کے نتیجے میں ایک معتدل رجحان شامل ہوا۔ اخوان کا یہ پہلا پارلیمانی تجربہ نہیں تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں بھی اخوان نے چند نشستیں حاصل کر لی تھیں تاہم اس کو نمایاں کامیابی ۱۹۸۹ء ہی میں حاصل ہوئی اور تحریک کے روایتی اعتماد' فعالیت اور وقار میں بھی اضافہ ہوا۔

پارلیمان میں اخوان

یہ ایک تاریخ ساز لمحہ تھا جب اخوان نے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنے موقف کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کے لیے پارلیمان کو ایک مؤثر پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا۔ تحریک اخوان کا مقصد یہ تھا کہ ایوان

نمایندگان کے ذریعے معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے۔ ۱۹۸۹ء کے انتخابات سے قبل جو اخوان پارلیمان میں پہنچتے رہے' انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ ہم اخوان کی نمایندگی کر رہے ہیں یا ان کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اخوان نے کبھی بھی اپنے آپ کو سیاسی جماعت نہ سمجھا اور نہ ہی کوشش کی کہ انھیں سیاسی جماعت تسلیم کیا جائے۔ ۱۹۵۳ء میں اس وقت کے وزیراعظم کی جانب سے ایک خصوصی اجازت نامے کے ذریعے اخوان کو ایک ادارے (society) کی حیثیت سے رجسٹر کیا گیا تھا اور ابھی تک اخوان کی قانونی حیثیت ایک ادارے ہی کی ہے۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد' شاہ حسین نے پارلیمان کو معطل کر دیا۔ طویل تعطل کے بعد ۹ جنوری ۱۹۸۴ء کو یہ بحال ہوئی۔ چار سال قبل' انتخابات میں حصہ لے کر اور بلدیاتی انتخابات میں بے مثال نمایاں کامیابی حاصل کر کے اخوان جمہوریت کی مٹھاس چکھ چکے تھے۔ آزاد جمہوری عمل کی بدولت ہی یہ ممکن ہوا کہ مدابہ کی بلدیاتی کونسل میں اخوان نے غلبہ حاصل کر لیا (مدابہ عمان سے ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے)۔ قبل ازیں یہ بلدیاتی کونسل مسیحی اقلیت کے کنٹرول میں چلی آرہی تھی۔ مدابہ کے تجربے نے اخوان کو یہ جرات عطا کی کہ وہ ۱۹۸۴ء کے ضمنی انتخابات میں اپنے دو ممبر نامزد کر دیں اور ایک آزاد' اسلام پسند امیدوار کی حمایت کا اعلان کریں۔ اس طرح وہ ایوان نمایندگان میں اپنے چند اور لوگوں کو بھیجنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلدیاتی اور پارلیمانی انتخابات نے اخوان کو یہ موقع بھی فراہم کیا کہ اسلامی سیاست کے حق میں بڑھتی ہوئی فضا میں اپنی مقبولیت کا بھی جائزہ لے سکیں۔ انتخابات میں حصہ لینے سے وہ مہم چلانے' ہم خیال گروہ (lobby) تیار کرنے اور اتحادوں کی تشکیل کے تجربات سے خوب آشنا ہو گئے۔ اس حقیقت کا ادراک موجود تھا کہ جب تک انتخابات شفاف' مبنی برعدل اور مداخلت سے محفوظ رہیں گے' جمہوریت کا رخ اسلام پسندوں کی طرف رہے گا۔

کچھ مدت کے بعد زید رفاعی کی حکومت نے' جو شام کی حکومت کے ساتھ بہتر تعلقات کی خواہش مند تھی' اخوان پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اخوان پر پابندی عائد ہونے کے بعد ان پر سرکاری طور پر جو دباؤ ڈالا گیا وہ اس سے تو نسبتاً کم تھا جو مشرق وسطی یا شمالی افریقہ کی حکومتیں اپنے ممالک کی اخوانی تحریکات پر ڈال رہی تھیں لیکن تحریک اور حکومت کے درمیان غیر معمولی تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اخوان کے اہم اراکین کو ان کی ملازمتوں سے برخواست کر دیا گیا۔ ان میں معتدل مزاج ڈاکٹر عبداللطیف عربیات بھی شامل تھے جو بعد میں پارلیمان کے اسپیکر بنے۔ جس وقت انھیں ملازمت سے برخواست کیا گیا اس وقت وہ وزارت تعلیم کے انڈر سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ جو لوگ عتاب کا شکار ہوئے' ان میں جامعات کے اساتذہ بھی تھے۔ ان میں سے کئی بعد میں پارلیمان کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ مشتبہ افراد کی فہرست میں ان حضرات کو شامل کیا

گیا جو معروف تھے یا جن کے بارے میں خیال تھا کہ یہ اخوان کی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سرکاری اور پرائیویٹ ملازمت اور سفر کی پابندی ان پر عائد کر دی گئی۔ اچھے کردار کا سرٹیفکیٹ ہر اس شہری کے لیے لازم کر دیا گیا جو پاسپورٹ کے لیے درخواست دے' جو بیرون ملک جانا چاہتا ہو یا جسے کسی ملازمت کی تلاش ہو۔ اس فضا سے شدید مایوسی اور نامیدی پھیلی اور ان عناصر کے موقف کو تقویت ملی جو یہ سمجھتے تھے کہ شام اور مصر میں اخوان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے' حالات اس نہج پر جا رہے ہیں کہ حکمرانوں سے ایسا ہی ٹکراؤ اردن میں بھی ہونے والا ہے۔

تحریک کی اپنی صفوں میں عدم اطمینان اور غم و غصے کی فضا ایک ایسے وقت میں پیدا ہو گئی جب ملک میں اقتصادی مظاہروں کی پُرتشدد لہر چل رہی تھی۔ یہ اپریل ۱۹۸۹ء کا زمانہ تھا۔ فسادات کا آغاز معان کے جنوبی شہر سے ہوا۔ بعدازاں یہ فسادات شمال اور جنوب کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئے۔ جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ اخوان کا ان فسادات میں کوئی ہاتھ نہیں ہے' جبکہ قبل ازیں حکومت نے فوراً ہی یہ رائے قائم کر لی تھی کہ ان فسادات کے پیچھے اخوان کا ہاتھ ہے۔

شاہ اردن نے انقلاب روکنے اور برہم عوام کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ان کے نتیجے میں اہم سیاسی اصلاحات منظرعام پر آئیں۔ اس سے اخوان پر دباؤ کم ہوا اور ان کے شریک اقتدار بننے کا راستہ ہموار ہو گیا۔

انتخابات کا تجربہ

۱۹۸۹ء کے موسم گرما میں' شاہ اردن نے وزیراعظم زید رفاعی کو وزارت عظمیٰ سے فارغ کر دیا اور اس کے بعد اس منصب پر آنے والے زید بن شاکر کو پارلیمانی انتخابات کی تیاری کا حکم دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ انتخابات شفاف اور منصفانہ ہوں گے۔ اخوان کے چند لوگ' خصوصاً پرجوش افراد جو شکوک و شبہات کا شکار تھے' ان کا کہنا تھا کہ ناراض عوام کو راضی کرنے کے لیے شاہ اردن نے ایک چال چلی ہے۔ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ کا یہ اقدام نیک نیتی پر مبنی اور بروقت ہے اور ساری دنیا میں جمہوریت کے حق میں جو فضا پروان چڑھ رہی ہے اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ خدشات رکھنے والے افراد نے انتخابات کے قابل عمل' جائز اور معقول ہونے کے بارے میں کئی سوالات اٹھائے۔ کچھ سوال نظریاتی تھے اور کچھ تکنیکی نوعیت کے بھی تھے۔ بنیادی حلقوں سے مجلس شوریٰ تک یہی سوال زیربحث تھا کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے یا نہیں' اسی پر گرما گرم بحثیں اور طویل نشستیں منعقد ہوئیں۔ (۴)

تحریک کی مجلس شوریٰ ہر چار سال کے بعد براہ راست منتخب کی جاتی ہے۔ اخوان کے ارکان ملک کے طول و عرض میں شاخوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر شاخ سے مجلس شوریٰ کے لیے ایک رکن منتخب کیا جاتا

ہے۔ بعدازاں شوریٰ کے افراد سات رکنی مجلس عاملہ تشکیل دیتے ہیں جو المراقب العام کی زیرقیادت تحریک کے معاملات چلاتی ہے۔ المراقب العام اور مجلس عاملہ' مجلس شوریٰ کو جواب دہ ہوتے ہیں۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ اخوان جمہوری طریقہ کار پر کاربند چلے آرہے ہیں لیکن تنظیمی سطح پر جمہوریت کا عملی تجربہ انھیں ۱۹۸۹ء میں ہوا۔ تحریک کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں' یہ مسئلہ شاخوں کے غوروفکر کے لیے پیش کیا گیا۔ اکثریت نے حصہ لینے کے حق میں رائے دی۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ انتخابات میں حصہ لینے کے فوائد زیادہ ہیں اور نقصانات کم ہیں' وہ غالب رہے۔ جن کا خیال تھا کہ اسلام اور جمہوریت کا کوئی جوڑ نہیں ہے' وہ ناکام رہے۔ ایک نیا اسلامی طرز عمل سامنے آرہا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے مقابلے میں اب کہا گیا کہ جمہوریت ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک طریق کار ہے۔ شہری و انسانی حقوق اور معاشرتی آزادی کو شخصی استبداد سے بچانے کے لیے اس کو ایک معقول ہتھیار سمجھا گیا۔

انتخابات کے حامیوں نے کئی ایسے دلائل دیے جن سے ان کے مخالفین خاموش ہو گئے۔ کہا گیا کہ اگر انتخابات میں سازباز ہوئی اور ساری انتخابی سرگرمیاں تھیٹر کے ڈرامے کی حیثیت اختیار کر گئیں تب بھی اخوان کے لیے انتخابات سے باہر رہنے کے مقابلے میں اندر رہنا بہتر ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ پارلیمان کے محدود اختیارات ہیں اور اسے شاہ کسی بھی وقت معزول کر سکتا ہے' تب بھی پارلیمان کے اندر ایک اسلامی آواز کا ہونا اس سے بہتر ہے کہ کوئی آواز بلند کرنے والا ہی نہ ہو۔ کئی اور فوائد بھی گنوائے گئے' مثلاً یہ کہ مہم کی مدت کے دوران' اخوان کو عوام الناس سے براہ راست رابطے اور گفتگو کا کھلا موقع ملے گا۔ انھیں ملک کے مسائل پر کھل کر بات کرنے اور اس کا حل پیش کرنے کا موقع ملے گا۔ ایسا پہلے نہیں ہوا۔ مہم کے دوران انھیں یہ موقع بھی مل جائے گا کہ اس مہم کو دعوت کے لیے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کریں جو سرکاری ایجنسیوں کی مداخلت سے محفوظ ہو گا۔ علاوہ ازیں اس عمل کے نتیجے میں اخوان کی مقبولیت اور اس کے پیغام کی عوام میں پذیرائی کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ اس کے نتیجے میں وہ اس قابل بھی ہو سکیں گے کہ اپنی قوت اور اثرات کا جائزہ لے سکیں اور اپنے دفاتر اور ممبران کی کارکردگی کو پرکھ سکیں۔

چونکہ مشرقی اور مغربی کنارے کے درمیان انتظامی تعلقات کار دو برس قبل منقطع ہو چکے تھے' اس لیے کئی قسم کی اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ ایک طرف پارلیمان کی نشستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا اور وہ ۶۰ سے ۸۰ ہو گئیں۔ دوسری طرف نئے انتخابی حلقے قائم کیے گئے۔ مسیحیوں' سرکاشیہ' چیچن اور بدویوں کے لیے ۳ فی صد کے قریب نشستیں مختص کر دی گئیں۔ چونکہ اخوان کی صفوں میں عیسائی نہیں تھے' سرکاشیہ' چیچن اور بدوی گروہوں میں سے بھی کم ہی لوگ اخوان کا حصہ بن سکے تھے اس لیے نئے

حلقوں کا اضافہ اصلاً تحریک کو محدود رکھنے کی کوشش تھی۔ اخوان نے محسوس کیا کہ ان اصلاحات کے باوجود انھیں موقع ملے گا کہ ان حلقوں میں اپنی قوت کا جائزہ لے لیں جہاں ان کے مضبوط امیدوار ہیں یا جہاں معقول تعداد میں اخوان کے حامی موجود ہیں۔ چنانچہ مختلف انتخابی حلقوں میں ۲۷ افراد کو نامزد کیا گیا۔

اخوان نے ملک کے طول و عرض میں ایک کتابچہ تقسیم کیا جس میں تحریک کے انتخابی پروگرام کی تفصیلات کے ساتھ نامزد افراد کی تصاویر اور ان کا مختصر تعارف و خدمات درج تھیں۔ انتخابی جلسے انتہائی مؤثر ثابت ہوئے۔ عوام الناس کی اکثریت کو انتخابی جلسوں میں کھینچ لانے میں کوئی اور جماعت اس قدر کامیاب نہ رہی، جتنی کہ اخوان ہوئی۔ تحریک نے اپنے ارکان اور حامیوں میں یہ شعور بیدار کیا کہ انتخابی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے حامیوں کے نام درج ہونا اور ان کے پاس ووٹنگ کارڈ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اخوان کے شعبہ خواتین "الاخوات" نے خواتین کو تیار کیا کہ وہ انتخابات میں اپنا حق رائے دہی استعمال کریں۔ چونکہ قانونی طور پر مسلح افواج اور پولیس کے ملازمین ووٹنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اس لیے رجسٹرڈ ووٹوں کا ۶۵ فی صد خواتین پر مشتمل تھا۔

اخوان سے باہر کے کئی اسلام دوست افراد نے ان حلقہ ہاے انتخاب میں کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا جہاں اخوان کے لوگ بھی اپنے کاغذات جمع کرا چکے تھے۔ چونکہ اخوان کی نامزدگیاں کم تھیں اور نشستوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے اسلام دوست افراد نے کئی نشستوں سے کاغذات جمع کرائے۔ ایسے انتخابی حلقے بھی تھے جہاں اسلام پسند آزاد امیدوار اور اخوان کے نمایندے کے سوا کوئی امیدوار نہ تھا۔ غیر ضروری امیدواروں کے امکانات کو معدوم کرنے کے لیے اخوان نے کچھ مقامات پر اتحاد بنایا تاکہ ان امیدواروں کا خصوصاً راستہ روکا جا سکے جو ملک میں اسلامی نظام کے یکسر مخالف تھے۔ چار مختلف حلقہ جات میں اخوان نے چار مسیحی امیدواروں کے ساتھ بھی تعاون کیا۔ ان میں سے اخوان کے حمایت یافتہ دو مسیحی امیدوار کامیاب بھی ہو گئے۔

اسلامی پارلیمانی بلاک کی تشکیل

اخوان کے لیے یہ بڑی خوشی کا باعث ہوتا اگر ۲۷ میں سے ۱۰ نشستیں بھی مل جاتیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ یہ لوگ چار سے چھ نشستیں جیتیں گے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ تاہم اخوان نے ۲۲ نشستیں جیت لیں اور تقریباً تمام حلقوں میں ان کے کامیاب ہونے والے امیدواروں کے ووٹ بھی دوسرے حلقوں میں جیتنے والے ان کے مخالفین سے بہت زیادہ تھے۔ اخوان کے علاوہ، ۱۰ اسلام پسند بھی کامیاب ہوئے اور انھوں نے ایک مؤثر اسلامی پارلیمانی بلاک تشکیل دے دیا۔

پارلیمان کی سرگرمیوں میں سرفہرست نئے نامزد وزیراعظم بدران اور اخوان کی قیادت کے درمیان

مذاکرات شامل تھے۔ بدران نے اخوان کی قیادت سے کہا کہ آپ ہمیں اعتماد کا ووٹ دیں، ہم آپ کو پانچ سے سات وزارتیں دے دیں گے۔ یہ مذاکرات ناکام ہو گئے کیونکہ اخوان کا مطالبہ وزارت تعلیم کا تھا، جب کہ اس کی پیش کش ہی نہ کی گئی تھی۔ مذاکرات کی ناکامی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اقتدار میں شرکت کے اس تجربے کے لیے، جس کی پہلے کوئی نظیر نہ تھی، اخوان ذہنی طور پر یکسو نہ ہو سکے تھے۔

حکومت کا شریک بننے کی شدید مزاحمت اندرونی طور پر اخوان میں موجود تھی۔ انقلاب پسند عنصر کا خیال تھا کہ ایسی حکومت کا حصہ بننا جس کی بنیاد اسلامی شریعت نہ ہو، اسلام کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کے مترادف ہوگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عرب ممالک کے اس وقت کے نمایاں اخوانی علما کا ایک فتویٰ بھی ۱۹۸۰ء کے اوائل سے موجود تھا جس میں ایک غیر اسلامی حکومت میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن اس فتوے کو اخوان کے انقلابی عناصر کے ان قائدین نے چھپائے رکھا جو ۱۹۸۰ء کے عشرے کے بیش تر عرصے میں مجلس عاملہ میں غالب رہے۔ آخر کار اخوان کے ممبران پارلیمنٹ نے ۱۴ شرائط پورا کرنے کے وعدے پر بدران کو اعتماد کا ووٹ دے دیا۔ سب سے اہم اور ضروری شرط یہ تھی کہ حکومت شریعت کا نفاذ کرے اور ان تمام قوانین میں تبدیلیاں متعارف کرائے جو اردن کے دستور کی دفعہ ۲ سے متصادم ہیں جس کے مطابق اسلام اردن کا سرکاری مذہب ہے۔ اپنے موقف کی وضاحت کے لیے اخوان نے اعتماد کے ووٹ والی تقریر اور ۱۴ نکات ایک کتابچے میں شائع کیے اور اسے عوام الناس میں پھیلایا، اس کا عنوان تھا: "ہم نے اعتماد کا ووٹ کیوں دیا؟"

کابینہ میں شمولیت

پارلیمان کے پہلے سال میں اخوان کے ارکان پارلیمان ہی نہیں، ارکان تنظیم کے رویے میں بھی خوشگوار تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ جمہوریت کے مفید اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ آزادی اظہار پر جو پابندیاں عائد تھیں، وہ نرم کر دی گئیں اور خفیہ اداروں کی مداخلت کی سرگرمیوں کو محدود کر دیا گیا۔ لیکن جب ملکی صورت حال کے حقائق کی کڑواہٹ ان پر آشکار ہوئی تو ان کے اندر مایوسی کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا۔ اردن پر ۱۳ ارب ڈالر کا قرض تھا اور اس نے جمہوریت کا جو تجربہ کیا تھا اس کے جھٹکے ہمسایہ عرب ممالک میں محسوس کیے جا رہے تھے۔

دوسرے سال اخوان کے پارلیمانی گروہ کے سربراہ ڈاکٹر عبداللطیف عربیات اسپیکر منتخب کیے گئے۔ وزیراعظم بدران نے اخوان کو دوبارہ دعوت دی کہ کابینہ میں شمولیت اختیار کرلیں اور ملک کی اصلاح میں کردار ادا کریں۔ اخوان کی مطلوبہ وزارتیں: اوقاف، تعلیم، صحت، انصاف اور سوشل ویلفیئر، دے دی گئیں۔

خلیج کے بحران کے اس موقع پر حکومت اور اس کے مخالفین کے درمیان مثالی اتحاد و اتفاق دیکھنے میں آیا۔ شرکت اقتدار کے چار ماہ کا یہ ہنی مون اس وقت ختم ہو گیا جب امریکہ کے زیرانتظام مشرق وسطیٰ امن مذاکرات کی خاطر وزیراعظم بدران کو تبدیل کر دیا گیا۔

اسلامی ایکشن فرنٹ کا قیام

شاہ اردن نے ۶۰ ارکان پر مشتمل شاہی کمیشن تشکیل دیا تاکہ وہ سیاسی زندگی اعتدال پر لانے اور سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور رجسٹریشن کے لیے اصول و ضوابط وضع کر سکے۔ اس کمیشن میں مختلف نقطہ ہائے نظر کے لوگ شامل تھے' اسلام پسند گروہ میں ۱۰ میں سے چھ اخوان کے تھے۔

اخوان نے اس کے بعد ایک سیاسی جماعت کے طور پر کام کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اسلامی گروہوں اور افراد کو دعوت دی گئی کہ وہ ابتدائی اجلاسوں میں شریک ہوں تاکہ واحد جماعت تشکیل دی جا سکے۔ جن گروہوں کو دعوت دی گئی ان میں سلفی' سلسلہ صوفیا اور حزب التحریر کے لوگ شامل تھے لیکن کسی نے بھی مذکورہ سیاسی جماعت کے قیام پر اتفاق نہ کیا۔ ان کوششوں سے بالآخر اسلامک ایکشن فرنٹ وجود میں آیا' اس میں اخوان اور کئی آزاد اسلامی شخصیات شامل ہیں۔ فرنٹ کے بارے میں یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ جماعتوں کا الحاق نہیں ہے بلکہ یہ اردن کے ان عوام کا مشترکہ پلیٹ فارم ہے جو اسلام کو اپنا اول و آخر قرار دیتے ہیں۔

اخوان اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکے کہ فرنٹ' اخوان کا آرگن نہیں بنے گا بلکہ اپنے منشور' ضوابط' انتظامی معاملات اور فیصلہ سازی کے اختیارات کے ساتھ ایک آزاد سیاسی جماعت کا کردار ادا کرے گا۔ دوسرے لوگوں کو فرنٹ میں شامل کرنے کے لیے کہا گیا کہ فرنٹ اخوان کی قیادت سے رہنمائی حاصل نہ کرے گا نہ ہی ان کے کنٹرول میں ہو گا' لیکن اس پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا۔ سیاسی پارٹی میں اپنے کو تبدیل نہ کرنے کے لیے اخوان کی روایتی دلیل یہ رہی تھی کہ "وہ اپنے وژن اور وسیع تقاضوں کو ایک سیاسی پارٹی کے تنگ اور محدود دائرے کا پابند بنانا نہیں چاہتے' کیوں کہ ان کے پاس زیادہ جامع پروگرام ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ اخوان کو جمہوری عمل پر زیادہ اعتماد تھا ہی نہیں۔ ان کا نقطہ نظر صرف یہ تھا کہ جب کبھی جمہوریت کو لپیٹا جائے اور سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد ہو (جیسا کہ ۱۹۵۷ء میں ہوا تھا) تو اخوان پر ہاتھ نہ ڈالا جا سکے۔

جمہوری عمل پر پابندیاں

نومبر ۱۹۹۳ء میں ہونے والے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات' انتخابی قوانین میں تبدیلی کے بعد منعقد ہوئے اور اسلامی تحریک کو ان انتخابات میں کم تر کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخابی قوانین میں ترامیم کے علاوہ

حزب اختلاف نے حکومت پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ اس نے مداخلت کی تاکہ حزب اختلاف کے چند نمایندے ہی کامیاب ہوں۔ اخوان کے اندر بھی یہ بحث ہوتی رہی کہ کسے امیدوار ہونا چاہیے اور کسے اسلام پسند امیدواروں کی موجودگی میں سامنے نہ آنا چاہیے۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں اخوان کے ممبران پارلیمان کی تعداد ۲۲ سے کم ہو کر ۱۶ رہ گئی۔

اسلام پسندوں کو قوت و اقتدار سے محروم کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے گئے وہ پارلیمانی انتخابات تک محدود نہ تھے۔ ۱۹۹۵ء میں بلدیاتی کونسلوں کے انتخابات ہوئے۔ اردن کی حکومت نے حزب اختلاف کی تنظیم کو منتشر کرنے کا پرانا حربہ استعمال کیا۔ وہ سرکاری ملازمین جو حزب اختلاف کی حمایت کر رہے تھے' ان کو اپنے علاقوں سے دور دراز مقامات پر تعینات کیا گیا' ان کی جگہ ملک بھر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے ملازمین لائے گئے جو حکومت کی پالیسیوں کے حامی تھے۔ انتخابات کے موقع پر' اسلامی ایکشن فرنٹ کے ایسے اہم افراد کو' جو انتخابی مہم اور پولنگ کے مقامات کی نگرانی پر تعینات کیے جانے تھے' گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ لگایا کہ یہ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے تھے! اسی دوران میں اسلامی ایکشن فرنٹ کے نمایندوں نے الزام لگایا کہ حکومت اور حکومتی مشینری عام شہریوں کو ڈرانے دھمکانے کی مہم چلا رہی ہے تاکہ وہ اسلامی ایکشن فرنٹ کے حق میں اپنے ووٹ استعمال نہ کر سکیں۔

صوبہ زرقا' حکومت کا اہم اور اولین ہدف تھا کیونکہ روایتی طور پر یہ عرصہ دراز سے اسلام پسندوں کا گڑھ چلا آ رہا تھا اور یہاں ان کی کامیابی یقینی تھی۔ اگر اس اہم صوبے میں ان کو ناکام کر دیا جاتا تو یہ پروپیگنڈا کرنا آسان ہو جاتا کہ عوام کی حمایت اسلام پسندوں کے بجائے حکومت کو اور "امن منصوبہ" کو حاصل ہے۔

۱۱ جولائی کو' الیکشن کے دن' زرقا اور رصیفہ کے انتخابی مراکز پر لوگوں سے لدی ہوئی بسیں پہنچیں' بظاہر یہ ان پڑھ دیہاتی لگتے تھے۔ انھوں نے اپنے ووٹنگ کارڈ پر کر رکھے تھے اور ان میں سرکاری امیدواروں کے حق میں رائے درج تھی' لیکن درحقیقت وہ فوج کے لوگ تھے۔ ان پڑھ ہونے کی آڑ میں انھوں نے اپنے ووٹ ڈال دیے جب کہ ان کے نام ووٹر لسٹ تک میں درج نہ تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں اصل ووٹر جب انتخابی مراکز پر پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کے ناموں کے آگے ووٹ ڈالے جانے کا نشان لگ چکا ہے' اس لیے وہ ووٹ نہ ڈال سکے۔ اسلامی تحریک نے اخباری بیانات کے ذریعے اور مختلف افسران کو خطوط کے ذریعے اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد اخوان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے ۱۶ ممبران پارلیمان سے کہہ دیں کہ وہ انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں۔

اسلامی تحریک کے لیے بھی اور جمہوریت کے لیے بھی "امن منصوبہ" ایک بدشگونی بن گیا۔ "امن

منصوبے" کی ضرورت تھی کہ جمہوریت کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے۔ ۱۹۸۹ء کے انتخابات میں' جو شفاف تھے' اخوان اور حزب اختلاف کی دیگر جماعتوں نے ۷۰ فیصد نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات سے قبل ایک قانونی ترمیم کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ حزب اختلاف ۳۵ فیصد سے زائد نشستیں حاصل نہ کر سکی۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں حزب اختلاف پارلیمان تک پہنچ ہی نہ سکی۔ لیکن سارے کا سارا الزام حکومت یا "امن منصوبے" پر نہیں جاتا۔ اردن کے اخوان بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ انھیں اب اس کا احساس ہوا کہ بائیکاٹ کرنے کا اقدام' ان کی تاریخی غلطی تھا۔

داخلی انتشار

اسلامی ایکشن فرنٹ میں اخوان کے سابق اور موجودہ ارکان پارلیمنٹ جیسے سرکردہ لوگ شامل ہوئے۔ اپنے قائدین و کارکنان کے اعلیٰ معیار کے باوجود' فرنٹ کا سارا دارومدار اخوان پر تھا اور اخوان کو یہ اختیار حاصل رہا کہ وہ فرنٹ کو احکامات جاری کریں۔ وہ نئی سیاسی شخصیات کا ظہور دیکھ رہے تھے۔ تمام تر اختیارات فرنٹ کو تفویض کرنے کے بجائے ان کی کوشش یہ رہی کہ فرنٹ کبھی بھی ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نہ سرکا سکے۔ اس کی وجہ سے طرفین کے درمیان تناؤ میں اضافہ ہوا اور طاقت کے حصول کے لیے کش مکش سے بحران پیدا ہوا' نتیجہ یہ ہوا کہ فرنٹ کی سرگرمیاں عملاً ختم ہو گئیں اور دوسرے سیاسی گروہوں اور حکومت کی نظروں میں اس کا وقار باقی نہ رہا۔

اسرائیل اور اردن کے درمیان ۱۹۹۴ء کے "معاہدۂ امن" کے بعد جو اقدامات کیے گئے تھے' اخوان اس پر خوش نہ تھے۔ اخوان کے اکابرین کا موقف تھا کہ اسرائیل اور اردن کے درمیان تعلقات کی بحالی کی صورت میں سیاسی عمل میں شرکت درست نہیں۔ جمہوری عمل کی ساکھ اور افادیت کے بارے میں شکوک و شبہات مزید بڑھ چکے تھے۔ اسلامی ایکشن فرنٹ کے ارکان کا استدلال تھا کہ پارلیمان کے اندر جانے سے زیادہ نقصان باہر رہنے سے ہوگا۔ کچھ تو اس حد تک جا رہے تھے کہ منصوبہ امن کے باوجود' جس کے وہ مخالف تھے' حکومت میں شرکت کے فوائد پر زور دیتے تھے۔ ان کے خیال میں اس طرح اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کے نقصان کو محدود کیا جا سکتا تھا۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۶ء کو اخوان کی ایک کانفرنس میں شرکت اقتدار کے حق میں اور خلاف دو مضامین پڑھے گئے۔ یہ اجلاس ایک طویل بحث کا اختتام تھا اور اس کا آخری فیصلہ استصواب کے ذریعے ہوا۔ معمولی سے فرق کے ساتھ فیصلہ یہ ہوا کہ انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے اور اسی کو اخوان کا سیاسی موقف قرار دیا گیا۔ اخوان کے چند ارکان نے بشمول تین سابقہ ممبران پارلیمان' فیصلے کو مسترد کیا اور استصواب کے درست ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔

مذکورہ فیصلے کے محتاط تجزیے سے یہ بات بعدازاں واضح ہوئی کہ اخوان کے مرکزی عملے نے مسلسل ایسے سوچے سمجھے اقدامات کیے جن سے بائیکاٹ کے حق میں ووٹنگ کو متاثر کیا جاسکے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اخوان کا ترجمان السبیل بائیکاٹ کے حامیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے عام اخوان کی رائے کو متاثر کیا اور آخری نتیجے میں کردار ادا کیا۔ دوسری بات یہ کہ اخوان کے اندر اسو سب سے مؤثر ادارہ ہے۔ دینی نوعیت کی وجہ سے اس کے اخلاقی اثرات کسی بھی دوسرے ادارے کی نسبت زیادہ ہیں۔ اس کا نظام مرکزی عملے کے کنٹرول میں تھا جس نے بائیکاٹ کے لیے مہم چلائی۔ اس کے ذریعے ارکان کی انفرادی رائے پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جو لوگ سیاسی عمل میں شرکت کرنا چاہتے تھے ان کے بارے میں مہم چلائی گئی کہ ان کے ذاتی مفادات ہیں۔ حکومت میں شرکت کے حامیوں کے بارے میں مستوزر (مستقبل کا وزیر) کی اصطلاح استعمال کی گئی۔

اخوان کی ابھرتی ہوئی قیادت اسلامی ایکشن فرنٹ کو ایک فاصلے پر رکھنا چاہتی تھی اور طاقت سے محروم بھی۔ اس کا یہی راستہ تھا کہ ان کو بے مصرف اور بے عمل رکھا جائے۔ سیاسی عمل کے بائیکاٹ سے یہ مقصد ٹھیک ٹھیک حاصل ہوا۔ اخوان کا سیاسی پلیٹ فارم بننے کے بجائے' فرنٹ اخوان کا مدمقابل بلکہ متبادل بن گیا۔ ایک طرف تو یہ خوف لاحق تھا کہ اخوان کے روایتی کردار میں جھول آ جائے گا' دوسری طرف اخوان کے نئے رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ اگر فرنٹ کے حق میں اخوان کے سیاسی کردار کو محدود کیا گیا تو وہ خود کبھی بھی عوامی شخصیت نہ بن سکیں گے۔

انتخابات کے بائیکاٹ کو دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ اخوان نے اپنے نقصانات گننا شروع کر دیے۔ اپنی ہی سیاسی جماعت کو بے وزن کر دینے اور پارلیمان سے باہر رہنے کے سبب ان کا ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہیں رہ گیا ہے۔ ان پر تمام قسم کی پابندیاں عائد ہیں اور قومی اور عالمی سطح پر وہ کئی پلیٹ فارموں سے محروم ہو چکے ہیں' جن کے ذریعے وہ مختلف موضوعات پر اظہار خیال کر لیتے تھے۔ اس میں حکومت پر تنقید بھی شامل تھی۔

کھوئے ہوئے مواقع کی تلافی کے لیے اخوان نے آخرکار فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے موقف میں تبدیلی لے آئے۔ جولائی ۱۹۹۹ء میں تحریک نے فیصلہ کیا کہ مقامی بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بائیکاٹ کے فیصلے سے رجوع کیا جا رہا ہے۔ سیاسی عمل سے کنارہ کشی' چاہے کتنی محدود اور کتنی ہی مختصر ہو' کبھی بھی ایک حل نہیں ہونا چاہیے۔

اختتامیہ

جمہوری عمل سے اسلامی تحریکوں کو بے شمار فائدے پہنچے ہیں۔ یہ بھی کم نہیں ہے کہ اس سے ان

تحریکوں کے روایتی طرز فکر' ہیئت اور تنظیم کی خامیاں واضح ہوئی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان تطابق کا مسئلہ اسلام پسندوں کے لیے پریشانی کا اور مخالفین کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ بہرحال تطابق کا یہ مسئلہ جلد طے ہو گیا۔ اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے جو سوالات اٹھائے جاتے تھے کم سے کم احیاے اسلام کی تحریکوں نے ان پر بحث کی اور اطمینان بخش جواب دیے اور ان کو نبٹا دیا۔

اردن میں' اور عالم عرب میں دیگر مقامات پر بھی' اسلامی تحریک کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے وہ جمہوری اقدار کے مطابق طرز عمل اختیار کرنا ہے جو رواداری' آزادی راے' شفاف طرز عمل اور احتساب کا تقاضا کرتا ہے۔ اسلامی تحریکیں اقتدار میں شرکت کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور جمہوری کھیل کے ضوابط کو تسلیم کرنے کا عہد کرتی ہیں۔ اس لیے انھیں نہ صرف قومی سطح پر بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنی تنظیموں میں جمہوری طریقہ کار کا احترام کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اردن میں اخوان کا بحران کوئی منفرد نہیں ہے۔ مصر میں خصوصاً اوسط کے واقعے کے اثرات کے بعد' جو شدید بیماری کی ایک علامت قرار دی جا سکتی ہے' بحران زیادہ شدید ہے۔ دنیا بھر میں اخوان کی شاخوں میں باہمی کش مکش کے عناصر موجود ہیں۔ یہ حکومتوں کے خلاف جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اسلامی تحریکوں کے اندر اپنے اداروں کو جدید بنانے اور اپنے طریقہ کار کو جمہوری بنانے کے خلاف مزاحمت کا ردعمل ہے۔ اسلامی تحریک کا حالیہ تجربہ واضح کر دیتا ہے کہ ابھی تک کیا سیاسی ہے اور کیا مذہبی ہے' اس بارے میں ذہن واضح نہیں ہیں' نیز ایک قائد اور مجلس عاملہ کے کردار کے بارے میں الجھاؤ (confusion) بڑے پیمانے پر موجود ہے۔ ایک ادارہ جو جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اسے ایک سلسلۂ صوفیا یا ذاتی کاروبار کی طرح نہیں چلایا جانا چاہیے اور ایک منتخب منتظم کو یہ اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ یہ دعویٰ کرے یا ایسا ظاہر کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی کر رہا ہے اور اس لیے وہ غلطی نہیں کر سکتا

(۱۷ جولائی ۱۹۹۹ء کو کیوٹو یونی ورسٹی' جاپان میں پڑھا گیا۔ بہ شکریہ Encounter' جلد ۵' شمارہ ۲' مجلّہ اسلامک فاؤنڈیشن' لسٹر' برطانیہ)۔

حواشی

1. *Facts About Jordan: Government and Politics; Factsheet No. 2* (Washington, DC; The Jordan Information Bureau, Nov. 1992).
2. M. Al-Hasan, *Al-Ikhwan fi Sutur* (The Brotherhood in Brief) (Amman, 1990), p. 56.
3. Qutb; *Milestones*, English edition (New Delhi; Naushaba Publications, 1991). See also S. [redacted]

شفاخانے، مسلمانوں کی طبی خدمات

ڈاکٹر غلام قادر لون

مؤرخین نے عہد وسطیٰ کے شفاخانے کے لیے "بیمارستان" کا لفظ استعمال کیا ہے، جو دو لفظوں "بیمار" اور "ستان" (جگہ) سے مل کر بنا ہے۔ یوں فارسی زبان کی اس ترکیب "بیمارستان" کے معنی "بیمار کی جگہ" ہے۔ عربوں کے یہاں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ ایران کے صوبہ خورستان کے شہر جندی شاپور میں ساسانی حکمرانوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں طب کی تعلیم دی جاتی تھی، مدرسے میں ایک بیمارستان بھی تھا۔ اس مدرسے نے مسلم طب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایرانی اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ عربوں نے شفاخانے کے لیے فارسی ترکیب "بیمارستان" لی اور اسے اپنے یہاں رائج کیا۔ بیمارستان کا لفظ آگے چل کر "مارستان" بن گیا۔ اکثر طبی تصانیف میں مارستان ہی استعمال ہوا ہے۔[1]

اسلام میں سب سے پہلا شفاخانہ خلیفہ ولید بن عبدالملک (۷۰۵ء-۷۱۵ء) نے دمشق میں بنوایا۔ ۷۰۷ء میں خلیفہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسلامی دنیا کا یہ اولین شفاخانہ جذامیوں کے لیے مخصوص تھا۔ خلیفہ نے مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے اطبا تعینات کیے اور ان کے لیے تنخواہیں مقرر کر دیں۔ بیماروں کے لیے معاش اور طعام و قیام کا انتظام شفاخانے ہی میں کیا گیا۔ انھیں ہدایت تھی کہ وہ باہر آکر تندرست لوگوں سے میل جول نہ رکھیں۔

خلافت عباسیہ میں خلیفہ ہارون الرشید نے جندی شاپور کے مدرسہ طب سے تحریک پا کر عیسائی طبیب جبرئیل بن بختیشوع کو بغداد میں شفاخانہ کھولنے کا حکم دیا۔ شفاخانہ قائم ہوا تو جندی شاپور کے بیمارستان سے ایک ماہر دواساز ماسویہ کو بغداد لایا گیا۔ بعد میں ماسویہ کا بیٹا یحییٰ بیمارستان کا نگراں مقرر ہوا۔ ہارون الرشید کے عہد میں بغداد میں متعدد ہسپتال بنوائے گئے، ان کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی نے اپنے خرچ سے "بیمارستان برامکہ" تعمیر کیا، جس کا نگراں ایک ہندستانی طبیب ابن دھن مقرر تھا۔ اس کے بعد بغداد میں خلیفہ المعتضد (۸۹۲ء-۹۰۲ء) نے دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر ایک بیمارستان بنوایا، جس کے اخراجات، خلیفہ متوکل کی والدہ سجاح کے وقف سے پورے ہوتے تھے۔ تیسری صدی ہجری ہی میں بغداد

کے محلہ حربیہ میں ایک اور بیمارستان قائم کیا گیا جو "بیمارستان حربیہ" کہلایا۔ خلیفہ المقتدر (۹۰۸ء-۹۳۲ء) کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے ۹۱۴ء میں ایک وقف مقرر کیا۔ جون ۹۱۸ء میں سنان بن ثابت نے بغداد کے بازار سوق یحییٰ میں خلیفہ المقتدر کے حکم سے "بیمارستان السیدہ" بنوایا جس کا ماہوار خرچ ۶۰۰ دینار کے قریب تھا۔ اسی سال خلیفہ نے سنان کے مشورے پر بغداد کے باب الشام میں اپنے نام پر ایک شفاخانہ تعمیر کروایا جو "بیمارستان المقتدری" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا ماہانہ خرچ ۲۰۰ دینار تھا، جو خلیفہ اپنی جیب خاص سے دیتے تھے۔ عباسی عہد کے مشہور وزیر ابن الفرات نے اپنے نام پر بغداد میں "بیمارستان ابن الفرات" قائم کیا۔ یہ شفاخانہ محلہ "درب المفضل" میں واقع تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں خلافت اسلامیہ کا سب سے شان دار ہسپتال عضدالدولہ بویہی (۹۴۹ء-۹۸۲ء) نے ۹۸۲ء میں بنوایا، جو "بیمارستان عضدی" کے نام سے مشہور ہوا۔ "بیمارستان عضدی" نہ صرف بغداد بلکہ عالم اسلام کا بہترین شفاخانہ تھا۔

دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں شفاخانے کھولے گئے۔ اسی زمانے میں رے اور نیشاپور میں کئی بیمارستان بنوائے گئے۔ رے کا بیمارستان بہت بڑا تھا۔

مصر میں سب سے پہلے خلیفہ متوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے ہسپتال بنوایا، جو "بیمارستان مغافر" کے نام سے مشہور تھا۔ بعدازاں احمد ابن طولون (المتوفی ۸۸۴ء) جب مصر کے والی ہوئے تو انھوں نے اپنے نام پر ایک بڑا بیمارستان بنوایا، جو "بیمارستان احمد بن طولون" کہلایا۔ یہ بیمارستان ۸۷۲ء میں بنا۔ مصر کا ایک اور بیمارستان "بیمارستان کافوری" کے نام سے مشہور تھا۔

اسلامی مملکت کا سب سے شاندار شفاخانہ بغداد کا "بیمارستان عضدی" تھا، جس کی تقلید میں مختلف شہروں میں بڑے بڑے بیمارستان بننے لگے۔ چھٹی صدی ہجری میں نورالدین زنگی (۱۱۴۶-۱۱۷۵ء) نے دمشق میں ایک بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا جو "بیمارستان کبیر دمشق" کہلایا۔ اسی صدی میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ کے شاہی ایوان میں "بیمارستان صلاح الدین غازی" بنوایا۔ شفاخانے کی دیواروں پر مکمل قرآن مجید لکھا ہوا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے اسکندریہ میں بھی ایک ہسپتال تعمیر کروایا، جس کا تذکرہ مؤرخین نے کیا ہے۔ بغداد کے بیمارستان عضدی اور دمشق کے بیمارستان کبیر کے بعد سلطان منصور قلاؤن نے قاہرہ میں ایک بہت بڑا ہسپتال بنوایا۔ یہ شفاخانہ انھوں نے ایک بڑے محل میں قائم کیا۔ ملک منصور نے محل کی عمارت کے علاوہ متعدد عمارات بنوائیں جن کی تعمیر میں مصر کے تمام مزدور اور ۳۰۰ قیدی ہر روز کام کرتے تھے۔ بادشاہ خود بھی روزانہ عمارات کے ملاحظہ کے لیے آتا تھا۔ ۱۱ ماہ لگاتار کام کے بعد ۱۲۸۴ء میں یہ عظیم الشان ہسپتال پایہ تکمیل کو پہنچا، جس محل میں یہ بیمارستان کھولا گیا، اس کا احاطہ ۱۰۶۰۰ گز تھا۔ عمارت کے ستون سنگ مرمر اور سنگ رخام سے تیار کرائے گئے تھے۔ یہ ہسپتال "مارستان المنصور" کے نام سے مشہور

ہوا۔ ول دوراں (Will Durrant) کے بقول یہ قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال تھا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۲)۔

مصر کے علاوہ افریقہ کے دوسرے اسلامی خطوں میں بھی ہسپتال قائم کیے گئے۔ سلطان یعقوب المنصور الموحدی (۱۱۸۴-۱۱۹۹ء) نے مراکش میں ایک بڑا بیمارستان بنوایا۔ مرینی سلاطین نے یعقوب المنصور کے شفاخانوں کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ خود بھی متعدد شفاخانے تعمیر کرائے۔ سلطان عبدالغالب مائتہ السعدی (۱۵۵۷-۱۵۷۴ء) نے مراکش میں ایک ہسپتال تعمیر کروایا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' بذیل مادہ "بیمارستان" از G.S. Colin' ج ۵' ص ۳۰۷-۳۰۸)۔

ترکی کے سلاطین نے بھی شفاخانوں کے قیام کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے یہاں ہسپتال کے لیے بیمارستان اور مارستان کے علاوہ دارالشفا' دارالعافیہ اور تیمار خانہ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ سب سے پہلا سلجوقی دارالشفا ۱۲۰۶ء میں قیصری میں قائم ہوا۔ بعدازاں دوسرے مقامات سیواس' دیورھری' چانکیری' قسطمونی' قونیہ' توقاد' ارزروم' ارزنجان' ماردین اور آماسیہ میں شفاخانے کھولے گئے۔ عثمانی سلاطین نے سب سے پہلا ہسپتال "دارالشفاے یلدرم" کے نام سے بروسہ میں ۱۳۹۹ء میں کھولا۔ اس کے بعد ۱۴۷۰ء میں محمد دوم الفاتح ۱۴۵۱-۱۴۸۱ء نے "دارالشفاے فاتح" تعمیر کیا۔ نویں صدی ہجری ہی کے آخر میں ادرنہ میں دریا کے کنارے ایک عمارت بنوائی اور اس کے ایک حصے میں دارالشفا کھولا' اس کی تعمیر آٹھ برسوں میں مکمل ہوئی۔ سولھویں صدی عیسوی کے دوران استنبول میں تین بڑے ہسپتال کھولے گئے۔ ان میں سلیمان اعظم کی بیوی خرم سلطان کے نام پر خاصکی کا بیمارخانہ ۱۵۳۹ء میں تعمیر ہوا۔ ۱۵۵۵ء میں سلیمان کے نام پر ایک دارالشفا اور مدرسہ طب وجود میں آئے۔ سلطان مراد ثالث کی والدہ بانو سلطان کے نام پر "توپ طاشی کا بیمارخانہ" ۱۵۸۳ء میں بنوایا گیا جو ۱۹۲۷ء تک چلتا رہا۔ منیہ میں حافظ سلطان کی والدہ کے نام پر بھی ۱۵۳۹ء میں ایک بڑا ہسپتال تعمیر کیا گیا۔ اگلی صدی کے دوران ۱۶۱۲ء میں استنبول میں ایک اور ہسپتال قائم ہوا' خلافت عثمانیہ کے آخری دور کے شفاخانوں میں استنبول میں بچوں کا شِشلی (شیشہ دار) شفاخانہ بھی قابل ذکر ہے' جسے سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۸۹۸ء میں بنوایا۔ بڑے ہسپتالوں کے علاوہ سلطنت ترکی کے دوسرے مقامات پر بھی شفاخانے کھولے گئے تھے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ بذیل مادہ' "بیمارستان" از Bedi N. Seshvaroglu' ج ۵' ص ۳۰۹-۳۱۱)۔

مسلم اسپین میں بھی شفاخانوں کے قیام میں خلفا نے خاص دلچسپی لی۔ قرطبہ میں ایک بڑا ہسپتال کھولا گیا' جس کے چیف سرجن ابوالقاسم زہراوی تھے۔ غرناطہ اور دوسرے شہروں میں بھی متعدد شفاخانے بنوائے گئے۔ ہسپتالوں میں مسلمانوں کی دل چسپی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف قرطبہ میں تین

6

درجن سے زائد شفاخانے موجود تھے۔

ہسپتالوں کے قیام میں برعظیم ہندوپاک کے مسلم سلاطین بھی اپنے ہم مذہبوں سے پیچھے نہیں رہے۔ محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے عہد حکومت میں ۱۲۰۰ اطبا سرکاری ملازم تھے۔ صرف پایۂ تخت دہلی میں چھوٹے بڑے شفاخانوں کی تعداد ۷۰ تھی۔ ان کے جانشین فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے مزید پانچ شفاخانوں کا اضافہ کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے تخت نشین ہونے کے بعد ایک فرمان جاری کیا، جس میں ۱۰۰ شفاخانے قائم کرنے کا حکم بھی شامل تھا۔ مغل حکمرانوں میں جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲-۱۶۰۵ء) نے متعدد دارالشفا قائم کرائے، جن میں کئی اکبر آباد میں تھے۔ جہاں گیر نے ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی حکم دیا کہ بڑے شہروں میں شفاخانے کھولے جائیں اور بیماروں کے علاج کے لیے اطبا مقرر کیے جائیں، جن کے اخراجات سرکاری خزانے سے دیے جائیں۔ شاہ جہاں، اورنگ زیب اور ان کے بعد کے حکمرانوں نے بھی بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے قائم کیے (طب العرب، ص ۴۹۰-۴۹۳)۔

قرون وسطیٰ کے دوران خلافت امویہ کے مختلف شہروں میں شفاخانوں کا جال پھیلایا گیا تھا۔ خراسان، موصل، حلب، اسکندریہ وغیرہ میں ان گنت شفاخانے قائم تھے۔ مؤرخوں اور سیاحوں نے جو چشم دید حالات بیان کیے ہیں ان کے مطابق بغداد میں ۶۰ شفاخانے تھے۔ قرطبہ کے شفاخانوں کی تعداد ۵۰ تھی۔ اکیلے استنبول میں ترکوں نے پانچ صدیوں کے اندر ۷۰ شفاخانے قائم کیے۔ قاہرہ، دمشق اور دوسرے بڑے شہروں کا حال اس سے مختلف نہ تھا۔ میکس میرہاف کا بیان ہے:

> ہسپتال شروع ہی میں قائم کیے گئے اور یہ غالباً قدیم اور مشہور مدرسہ جندی شاپور کے نمونے پر بنوائے گئے، جس میں ایک بیمارستان بھی تھا۔ اسلامی دنیا میں اسی سے ہسپتال کے لیے بیمارستان کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔ ہمارے پاس کم از کم ۳۴ ایسے اداروں کے بارے میں مستند معلومات موجود ہیں، جو ایران سے مراکش اور شمالی شام سے مصر تک پھیلے ہوئے تھے (The Legacy of Islam, pp 335-336)۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ میکس میرہاف کا یہ بیان عہد زریں یعنی ۹۰۰-۱۱۰۰ء تک کے ہسپتالوں تک محدود ہے اور اس میں بھی مسلم اسپین شامل نہیں ہے۔

مسلم شفاخانوں کی یہ زریں تاریخ یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ولید نے جو پہلا شفاخانہ قائم کیا وہ جذامیوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ بدنصیب طبقہ ہر دور میں دردمند مسلم حکمرانوں کے لیے باعث توجہ رہا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف جذامیوں بلکہ اندھوں، یتیموں اور اپاہج عورتوں کے لیے بھی مناسب انتظام کیا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ہر اپاہج کے لیے ایک خادم اور ہر اندھے کے لیے ایک عصاکش مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد خلیفہ منصور نے نابینا انسانوں' یتیموں اور اپاہج عورتوں کے لیے ایک دارالاقامہ (ہوسٹل) بنوایا۔ موحدین میں سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنی سلطنت کے الگ الگ حصوں میں پاگلوں' کوڑھیوں اور اندھوں کے لیے شفاخانے بنوائے۔ ترک سلاطین نے سیواس' قسطمونی اور قیصری میں کوڑھی خانے تعمیر کیے' جن میں کوڑھ کے مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔ نویں صدی ہجری میں سلطان مراد دوم (۱۴۲۱-۱۴۵۵ء) نے اورنہ میں ایک کوڑھی خانہ بنوایا جو دو سو سال جاری رہا۔

کوڑھ کے مریضوں کو جذامی کے بجائے مرضی کہا جاتا تھا۔ یہ نام انھیں حسن تعبیر کے طور پر دیا گیا تھا۔ عام طور پر انھیں شہر سے الگ ایک بستی میں بسایا جاتا تھا۔ شہر قرطبہ کا ایک پورا محلہ ربض المرضی (بیماروں کی بستی) کی حیثیت سے معروف تھا۔ فاس میں کوڑھیوں کو پہلے باب الخوخہ سے باہر تلمسان جانے والی سڑک پر بسایا گیا' پھر ساتویں صدی ہجری میں انھیں باب الشریعہ کے باہر غاروں میں رکھا گیا۔ ۶۵۸ھ میں انھیں باب الشریعہ کے باہر دوسرے غاروں میں بسایا گیا۔ کوڑھیوں کی اس بستی کو "الحارہ" کہا جاتا تھا' اکثر مسلم شہروں میں "الحارہ" ضرور ہوتے تھے لیکن ضرورت اور حالات کے پیش نظر "الحارہ" ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی ہوتا تھا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۷-۳۰۸)۔

شفاخانوں کی طرح مسلمانوں نے پاگلوں کے لیے "دارالمجانین" کے نام سے پاگل خانے تعمیر کرائے۔ اسلام میں سب سے پہلا پاگل خانہ خلیفہ منصور نے بنوایا' جسے دارالمجانین کہتے تھے۔ تیسری صدی ہجری میں واسط اور بغداد کے درمیان دیرہکل کے مقام پر ایک پاگل خانہ تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں دمشق میں ایک پاگل خانہ بنوایا گیا جس میں پاگلوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ اسی صدی میں سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنی سلطنت میں پاگل خانے قائم کیے' مستقل پاگل خانوں کے علاوہ ہسپتالوں میں بھی پاگلوں کے لیے علیحدہ وارڈ تھے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۷-۳۰۸)۔ قاہرہ میں "بیمارستان احمد ابن طولون" میں پاگلوں کے لیے مخصوص وارڈ تھے۔ قاہرہ ہی میں صلاح الدین ایوبی کے بنائے ہوئے بیمارستان میں پاگلوں کے علاج کے لیے الگ الگ مکانات تھے' جو ایک علیحدہ وسیع احاطے میں تھے۔ دریچوں میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں (طب العرب' ص ۴۸۵)۔

قرون وسطٰی کے مسلم شفاخانوں میں بعض غیر ملکیوں' پردیسیوں' غریبوں اور بیمار مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ سلطان یعقوب المنصور الموحدی نے اپنے دارالسلطنت میں ایک شان دار ہسپتال بنوایا' جس میں ان لوگوں کا علاج کیا جاتا تھا جو غریب الدیار یا پردیسی ہوتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں بنونصر کے سلطان محمد پنجم نے غرناطہ میں ایک شان دار شفاخانہ کھولا' جس کی عمارت ۱۳۶۷ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں

صرف غریب مسلمانوں کا علاج ہوتا تھا۔ سلطان ابو فارس الحفصی نے "مفلس" غریب الدیار اور بیمار مسلمانوں کے لیے ایک شفاخانے کی بنیاد ڈالی' جو ۱۴۲۰ء میں مکمل ہوا۔ اسلامی قلمرو کے دوسرے شہروں میں بھی اس طرح کے ادارے قائم ہوئے۔ مغرب کے مسلم حکمرانوں نے شفاخانوں کے علاوہ مسافروں کے لیے شہروں کے باہر منزل بھی بنائے جہاں مسافر قیام کرتے تھے۔ انھیں تراویہ کہتے تھے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۷-۳۰۹)۔

مسلمانوں نے دسویں صدی عیسوی ہی میں جیل خانوں میں قیدیوں کے علاج معالجے کا بندوبست کیا تھا۔ المقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے افسرالاطبا سنان بن ثابت کو حکم دیا کہ اطبا کی ایک جماعت مقرر کی جائے جو روزانہ جیلوں میں جا کر بیمار قیدیوں کا علاج کرے۔ سنان نے حکم کی تعمیل کی اور اطباع کا عملہ مقرر کیا۔ یہ لوگ روزانہ ہر جیل میں جا کر معائنہ کرتے تھے۔ بیمار قیدیوں کا علاج کیا جاتا اور حسب ضرورت ان کے لیے ایسی غذا تیار کرواتے تھے جس میں گوشت نہیں ہوتا تھا بلکہ دھنیا وغیرہ ڈال کر بیماروں کے لیے پکتا تھا' اسے "مزورات" کہتے تھے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۵)۔

گشتی ہسپتالوں کا قیام بھی اسی وزیر کی یادگار ہے۔ انھوں نے سنان بن ثابت کو حکم دیا کہ اطبا کی ایک جماعت ادویات اور سامان ساتھ لے کر دیہات میں گشت کرے۔ چنانچہ سنان نے تجربہ کار ڈاکٹروں کا ایک عملہ تیار کیا۔ یہ لوگ دیہات میں گشت لگا کر ہر گاؤں میں پہنچ جاتے تھے۔ ان کے ساتھ گشتی دواخانہ اور ضروری سامان ہوتا تھا۔ بقدر ضرورت ہر گاؤں میں قیام کر کے کسانوں اور نادار لوگوں کا علاج کرتے تھے۔ وزیر کی طرف سے ہدایت تھی کہ علاج میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق نہ کیا جائے' البتہ حیوان سے پہلے انسان اور غیر مسلم سے پہلے مسلم کا علاج کیا جائے۔ کسی گاؤں میں پہنچ کر اگر رہبر بہم نہ ہو تو تب تک وہیں قیام کیا جائے' جب تک مناسب انتظام نہ ہو جائے (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۵)۔

گشتی ہسپتال کی روایت کا آغاز ۹۳۱ء میں ہوا۔ ایک صدی کے اندر گشتی ہسپتال رائج ہو گئے تھے۔ گشتی شفاخانے گیارھویں صدی عیسوی میں معروف تھے (The Legacy of Islam, p 336)۔

فوج کی طبی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایسے شفاخانے قائم کیے گئے' جو سفر و حضر میں فوج کے ساتھ ہوتے تھے۔ سلطان محمود سلجوقی کا لشکر جب چلتا تو ان کا شفاخانہ ۴۰ اونٹوں پر لدا ہوتا تھا' جس کی حفاظت کے لیے ایک فوجی دستہ متعین تھا۔ فوج کے ساتھ جو اطبا ہوتے تھے وہ نہایت تجربہ کار اور باصلاحیت ہوتے تھے۔

مسلم شفاخانوں کے انتظام کے متعلق مورخوں نے مکمل تفصیلات فراہم کی ہیں:

اسلامی تاریخوں میں ان اداروں کے انتظام کے بارے میں بہت ہی درست معلومات دی گئی ہیں۔

ہم نہ صرف ان اداروں کے ذرائع آمدنی سے باخبر ہیں بلکہ اطبا' ماہرین امراض چشم اور ملازموں کی تنخواہیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں (The Legacy of Islam, p 336)۔

مسلم بیمارستانوں کے مصارف کے لیے سرکار یا بعض اوقات امرا کی طرف سے اوقاف مقرر ہوتے تھے' جن کی سالانہ آمدنی سے ہسپتال کا خرچہ چلتا تھا۔ اوقاف متولی یا مہتمم کے زیر نگرانی ہوتے تھے' وہی شفاخانے کی ضروریات کے لیے رقم مہیا کرتا تھا۔ بغداد کے بیمارستان عضدی کے لیے عضدالدولہ نے ساڑھے ۷ لاکھ درہم سالانہ کی جاگیر وقف کر رکھی تھی۔ ملک منصور قلاؤنی نے قاہرہ میں "بیمارستان الکبیر المنصوری" بنوایا تو اخراجات کے لیے ۱۰ لاکھ درہم سالانہ کے اوقاف مقرر کیے۔

عہدوسطیٰ کے ان طبی اداروں کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک مکمل انتظامیہ موجود تھی۔ ہر شفاخانے کی نگرانی ایک بڑے طبیب کے ذمے ہوتی تھی جسے ساعور کہتے تھے۔ حکومت اپنی طرف سے اس شخص کو ساعور مقرر کرتی تھی جو اعلیٰ درجے کا طبیب ہوتا تھا۔ ہسپتال کا عملہ ساعور کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ یہ عہدہ سب سے پہلے بختشوع کو ملا تھا۔ بغداد کے بیمارستان رشیدی میں یوحنا ابن ماسویہ رئیس الاطبا (ساعور) تھے۔ جندی شاپور کے بیمارستان میں یہ عہدہ مشہور طبیب سابور بن سہل کو ملا تھا۔ رے کے ہسپتال میں ابوبکر رازی ساعور کے عہدے پر فائز تھے۔ بعد میں جب وہ بغداد چلے آئے تو انھیں ۱۰۰ سے زائد اطبا میں سے منتخب کر کے بڑے ہسپتال کا ساعور بنایا گیا۔ مختلف زمانوں میں جبرئیل بن عبیداللہ' ثابت بن سنان بن ثابت (المتوفی ۹۴۲ء) اور ابن التلمیذ (المتوفی ۵۶۰ھ) جیسے اطبا بغداد کے شفاخانے کے ساعور رہے۔ قاہرہ میں مہذب الدین عبدالرحیم ابن علی الدخوار مملوک عہد حکومت میں رئیس الاطبا کے عہدے پر فائز تھے۔ بیمارستان الکبیر المنصوری میں بھی انھیں رئیس الاطبا مقرر کیا گیا تھا۔ ان کے نامور شاگرد ابن النفیس بیبرس کے دور سلطنت میں رئیس الاطبا تھے۔ عہد عباسی میں ہسپتالوں کی نگرانی کے لیے ایک منتظم عمومی کا تقرر کیا گیا۔ خلیفہ المقتدر کے وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ نے ۹۱۵ء میں بغداد مکہ اور مدینے کے شفاخانوں کی نگرانی کا کام ابوعثمان سعید بن یعقوب الدمشقی کو تفویض کیا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۴)۔ منتظم عمومی کی حیثیت سے یہ غالباً پہلے شخص تھے۔ ان کے انتقال کے بعد سنان بن ثابت کو طبی اداروں کے نظم و نسق سنبھالنے کا کام تفویض ہوا۔ سنان شاہی طبیب تھے مگر انھیں منتظم عمومی کی حیثیت سے زیادہ شہرت ملی۔ جیسا کہ جارج سارٹن کہتے ہیں:

ان کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ بغداد کے شفاخانوں کا بہترین انتظام اور طبی پیشہ کا معیار بہتر بنانے کے اقدامات ہیں (Introduction to the History of Science, Vol. 1, p 641)۔

سنان بن ثابت کی اصلاحات اور انتظامی اقدامات نے طب کے وقار میں چار چاند لگائے۔ ۹۳۱-۹۳۲ء

میں خلیفہ مقتدر کو شکایت پہنچی کہ کسی نیم حکیم کے غلط علاج سے ایک شخص جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ خلیفہ نے شہر کے محتسب کو حکم دیا کہ جب تک سنان بن ثابت کے دستخط سے اطبا کے پاس اجازت نامے نہ ہوں' انھیں مطب کرنے سے روک دیا جائے۔ خلیفہ کے حکم پر سنان نے اطبا کا امتحان لینے کا طریقہ رائج کیا۔

> ۹۳۱-۹۳۲ء میں بغداد کے اطبا کو اس وقت تک مطب کرنے سے روک دیا گیا جب تک ان کا امتحان نہ لیا جائے اور وہ سرکاری سند حاصل نہ کریں۔ سنان نے' جن کے ذمہ یہ کام تھا' ۱۰۰ سے زائد اطبا کا امتحان لیا (ایضاً)۔

امتحان سے شاہی اطبا اور مسلمہ صلاحیت کے معالج مستثنیٰ کیے گئے تھے۔ بغداد کے غیر معروف اطبا کی تعداد تقریباً ۱۰۰۰ تھی' سنان بن ثابت نے ان کا امتحان لیا اور جو طبیب جس فن میں ماہر پایا گیا' اسے صرف اسی فن میں علاج کرنے کی سند دی گئی۔ امتحان میں ۱۰۰۰ اطبا میں سے صرف ۷۰۰ امیدوار کامیاب ہوئے۔ ناکام امیدواروں کو مطب کرنے سے روک دیا گیا۔ سنان بن ثابت کے اس طریقۂ کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطب کرنے کے لیے یا علاج کرنے کے لیے سرکار کی سند لازمی ہو گئی۔ ول دوراں کا بیان ہے:

> کوئی شخص امتحان میں کامیاب ہوئے بنا اور سرکاری سند حاصل کیے بغیر قانونی طور پر مطب نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح دوا فروش' حجام اور ماہرین امراض اطفال بھی سرکاری قواعد اور معائنہ کرانے کے پابند تھے (The Age of Faith, p 246)۔

اطبا کے امتحان کا طریقہ دوسرے ادوار و ممالک میں بھی جاری رہا۔ چھٹی صدی ہجری میں ابن التلمیذ نے اطبا کا امتحان لیا اور صرف ان لوگوں کو علاج کرنے کی اجازت دی' جو اس کے اہل پائے گئے۔ مصر اور شام کے رئیس الاطبا یا منتظم عمومی مہذب الدین الدخوار تھے۔ انھوں نے ملک العادل کے حکم پر ایک مرتبہ مصر کے کحالوں (ماہرین امراض چشم) کا امتحان لیا اور صرف ان کحالوں کو علاج معالجے کی اجازت دی' جو امتحان میں کامیاب ہوئے تھے (طب العرب' حصہ تشریحات و تنقیدات' ص ۲۸۸)۔ جن اطبا کو مطب کرنے کی اجازت ملی تھی ان کے نام رجسٹر میں درج ہوتے تھے۔ ممتحن مقرر کیے جانے کے وقت خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ دین دار' ماہر فن اور دیانت دار ہوں۔

اطبا سے امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کی جھلک عبدالعزیز مسلبب کی تصنیف امتحان الالباء لکافة الاطباء سے سامنے آتی ہے' جس میں کحال سے پوچھا گیا ہے کہ ایک ایک کے دو دو کیوں نظر آتے ہیں؟ شب کوری کے اسباب کیا ہیں؟ مجبر (ہڈی بٹھانے والے) سے سوال کیا گیا ہے کہ خلع اور میل کی علامات کیا ہیں؟ جبر کیا ہے؟ کون سی ہڈیاں ہیں جن پر دشبند نہیں بندھتی ہے؟ جراح سے دریافت کیا جاتا ہے کہ انسان کے بدن میں کتنی ہڈیاں ہیں؟ اعصاب اور عضلات کتنے ہیں؟ رگیں کتنی اور کہاں کہاں ہیں؟ (۲)

عہد اسلامی میں دوا فروشوں کی نگرانی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ترک سپہ سالار افشین نے زکریا طیفوری کو دوا فروشوں کی فہرست تیار کرنے کا حکم دیا اور ان کو چھاؤنی سے نکال دیا جو دھوکا باز تھے۔ دیانت دار دوا فروشوں کو خلیفہ کے پاس بھیج دیا۔ نجی دواخانوں کے علاوہ خود حکومت کی اپنی ڈسپنسریاں ہوتی تھیں۔ دواخانوں کے مالکوں کا امتحان لیا جاتا تھا اور صرف انھی کو ڈسپنسری چلانے کا لائسنس ملتا تھا جو امتحان میں کامیاب ہوتے تھے۔ دوا کی کیفیت اور قیمت پر سرکار کی طرف سے نگرانی کی جاتی تھی۔

ازمنہ وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں اطبا متعین ہوتے تھے۔ "بیمارستان عضدی" میں ۲۴ اطبا خدمات انجام دیتے تھے۔ ہسپتال میں ماہرین خصوصی کی مختلف جماعتیں کام کرتی تھیں جن میں طبائعیوں (ماہرین عضویات)، کحالوں (ماہرین امراض چشم)، جراحوں (سرجن) اور مجبروں (ہڈی بٹھانے والے) تھے۔ تبریز کے ربع رشیدی شفاخانے میں مختلف ممالک کے ۵۰ اطبا رہتے تھے۔ جراح، کحال اور مجبر اس کے علاوہ تھے۔ مسلم حکمرانوں کے پاس درباری اطبا بھی ہوتے تھے۔ سیف الدولہ جب دسترخوان پر بیٹھتے تھے تو ۲۴ ڈاکٹر موجود رہتے تھے۔ خلیفہ متوکل کے پاس مسلمان ڈاکٹروں کے علاوہ ۵۶ عیسائی اطبا تھے۔ درباری اطبا کو مختلف خدمتوں کے عوض دو دو تین تین تنخواہیں ملتی تھیں۔

اطبا میں ہمارے زمانے کے اسپشلسٹوں کی طرح مختلف امراض کے ماہرین خصوصی ہوا کرتے تھے۔ ان میں بعض فصاد، کچھ کحال اور کچھ اسنانی ہوتے تھے۔ بعض اطبا صرف عورتوں کے علاج کے ماہر تھے اور صرف یہی خدمت انجام دیتے تھے۔ مصر میں اکثر کحال تھے کیوں کہ وہاں آنکھوں کی بیماری عام تھی۔ یہ لوگ قدح عین کے ذریعے موتیابند کا اس طرح علاج کرتے تھے، جس طرح آج اس کا آپریشن کیا جاتا ہے۔ "بیمارستان عضدی" میں دوشنبہ اور جمعرات کے دنوں میں بغداد کے بڑے بڑے اطبا آتے اور پیچیدہ امراض کی تشخیص و امراض میں متعین اطبا کی مدد کرتے تھے۔ رئیس الاطبا کے کام کرنے کے ایام مقرر تھے۔

ہسپتالوں میں لائبریریاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے اطبا ہسپتالوں ہی میں طب کا درس دیتے تھے، عضدی ہسپتال میں لیکچر دیتے تھے۔ قاہرہ کے "بیمارستان الکبیر المنصوری" میں درس و تقریر کے لیے علیحدہ کمرے مخصوص تھے۔ شفاخانے میں متعین ممتاز طبیب کے لیے روزانہ معمول تھا کہ وہ بیماروں میں گشت لگا کر معائنہ کرے اور ان کا حال پوچھے۔ ہر بیمار کے لیے نسخے اور ہدایات تجویز کرے۔ نجی بیماروں کا معائنہ کرے، شام کو واپس ہسپتال آکر الایوان الکبیر (بڑے ہال) میں بیٹھ کر جہاں کتب خانہ بھی تھا، اطبا اور طلبہ کی جماعت کے ساتھ تین گھنٹے تک طبی مباحث اور درس میں مشغول رہے اور کتابوں کا مطالعہ کرے۔ تبریز کے "ربع رشیدی شفاخانے" میں ۵۰ اطبا تھے، جن میں سے ہر ایک کے ذمہ ہسپتال کے فرائض کے علاوہ ۱۰ طلبہ کو تعلیم دینا تھا۔ ان کے علاوہ بیمارستان میں جو جراح، کحال اور مجبر تھے ان میں ہر ایک کے ذمے پانچ

طلبہ کو عملی تعلیم دینا تھا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۶)۔

مسلم شفاخانوں میں الگ الگ وارڈ ہوتے تھے۔ بغداد کے بڑے دارالشفا میں متعدد وارڈ تھے۔ ہر وارڈ شاہی محلہ معلوم ہوتا تھا۔ قاہرہ کا منصوری ہسپتال محل میں قائم کیا گیا تھا جس کے چار بڑے ایوان تھے۔ بادشاہ نے بہت سی نئی عمارات بنوائیں۔ ہسپتال میں مختلف وارڈ تھے' قدیم چار ایوان نجار (حمیات) کے مریضوں کے لیے مخصوص تھے۔ آشوب چشم والوں کے لیے علیحدہ وارڈ تھا۔ موارد عمل جراحی (surgical cases) کے لیے اپنا الگ وارڈ اور امراض بطن یا اسہال کے بیماروں کے لیے علیحدہ وارڈ تھا۔ بیمار خواتین کے لیے زنانہ وارڈ علیحدہ تھے' جن کی تیمارداری اور خدمت کے لیے نرسیں تعینات تھیں۔ مردوں کے لیے جداگانہ وارڈ تھے' جن کے خدام اور تیماردار مرد ہوتے تھے۔ جرجی زیدان کے بقول مسلم شفاخانوں میں ہر مرض کے لیے علیحدہ وارڈ تھا یا مخصوص وارڈ بنائے گئے تھے۔ وارڈ کے لیے جو طبیب متعین ہوتا تھا وہ اس میں چکر لگاتا تھا۔ اس کے آگے وہ تیماردار اور خدام ہوتے تھے جو اس کام کے لیے مقرر ہوتے تھے۔ طبیب بیماروں کو تشفی دیتا' دوائیں تجویز کرتا اور ہر مرض کے لیے دوائیں لکھتا تھا۔ میکس میرہاف کا بیان ہے:

> شفاخانے دو حصوں میں منقسم ہوتے تھے۔ ایک حصہ مردوں اور دوسرا عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا' ہر حصے میں اپنا وارڈ اور ایک دواخانہ ہوتا تھا (The Legacy of Islam, p 336)۔

ہسپتالوں میں ادویات وافر مقدار میں موجود ہوتی تھیں' یہ دوائیں دور دراز ممالک یا شہروں سے منگائی جاتی تھیں---- رشید الدین طبیب نے سلطان علاء الدین کے عہد میں ہند کا دورہ کیا' جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ ہندستان سے وہ مفردات فراہم کیے جائیں جو فارس میں دستیاب نہ تھے۔ چنانچہ علاء الدین نے رشید الدین طبیب کو جو تحائف بصرے کی بندرگاہ کے راستے سے بھیجے' ان میں ۲۲ دوائیں شامل تھیں۔ "بیمارستان منصوری" میں روزانہ خرچ ہونے والی معمولی دواؤں کو چھوڑ کر خاص دواؤں میں صرف شربت انار کے ۵۰۰ رطل خرچ ہوتے تھے (طب العرب' ص ۴۸۸)۔ اودویہ سازی میں ماہر دواساز ملازم رکھے جاتے تھے۔ بیمارستان رشیدی کے لیے جندی شاپور کے ہسپتال سے ماسویہ جیسے ماہر دواساز کو لایا گیا تھا۔ ابن البزوخ دواسازی و عطر سازی میں مشہور تھے۔ احمد تمیمی اور احمد و عمر ابنائے یونس کو ادویہ سازی اور ترکیب نسخہ جات میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ شفاخانوں میں ادویہ سازی کے لیے مخصوص کمرے اور گودام ہوتے تھے۔ نسخے تیار کرنے کے لیے الگ کمرے تھے۔ اسپین کے ایک طبیب نے ادویہ سازی میں درکار نادر پودوں کی کاشت کے لیے ایک نباتاتی باغ لگوایا تھا۔ یہ پودے وہ دوران سفر دوسری جگہوں سے لائے تھے (The Legacy of Islam, p 336)۔

ادویہ سازی پر سابور بن سہل کی تصنیف قرابادین شفاخانوں میں رائج تھی، صیادلہ کی دکانوں پر بھی یہی استعمال ہوتی تھی۔ بعد میں ابن التلمیذ نے موجز بیمارستانی تصنیف کی تو شفاخانوں میں اس کا بھی رواج ہوا۔ بیمارستانوں میں استعمال ہونے والی دواؤں کے بارے میں انھوں نے ایک اور رسالہ مقالة امینیه فی الادویة البیمارستانیه تحریر کیا تھا۔

مسلم شفاخانوں میں وسیع انتظامی عملہ ہوتا تھا۔ ان میں دوائیں کوٹنے والے، نسخے تیار کرنے والے، مرہم پٹی کرنے والے، کھانا پکانے والے، خدام، منشی اور طبی افسر ہوتے تھے۔ شفاخانوں میں رہایشی مکانات بھی ہوتے تھے، جہاں طبی افسر اور انتظامی عملے کے دوسرے افراد قیام کرتے تھے۔

قاہرہ کے "بیمارستان منصوری" میں بیماروں کے کپڑے دھونے، مریضوں کو غسل کرانے، کمروں اور بستروں کی صفائی اور دوسری خدمتوں کے لیے نوکر اور نرسیں مقرر تھیں۔ خدمت کے لیے ہر مریض کو دو محافظ اور نگراں میسر تھے۔ مختلف قسم کی ادویات، تیل، پیالے اور دوسری چیزیں تقسیم کرنے کے لیے ملازم مقرر تھے، جن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ مطبخ میں اپنی نگرانی میں مریضوں کے لیے مقوی کھانے، مرغ، چوزے اور گوشت تیار کروائیں اور ہر بیمار کے لیے مجوزہ طعام ایک الگ اور خاص تھالی میں اس کے سامنے پیش کریں، جس میں کوئی دوسرا مریض شریک نہ ہو گا۔ ملازمین کو حکم تھا کہ وہ کھانا ڈھانپ کر بیماروں تک پہنچائیں اور تب تک ڈیوٹی انجام دیتے رہیں، جب تک تمام مریضوں کو کھانا فراہم نہیں کیا جاتا۔

"بیمارستان منصوری" میں بے خوابی کے مریضوں کے لیے علیحدہ وارڈ کا انتظام تھا۔ جہاں گویے اور داستان گو ملازم رکھے گئے تھے۔ یہ لوگ موسیقی اور دلچسپ قصوں سے بیماروں کو خوش کرتے تھے۔ مریضوں کو مطالعے کے لیے تاریخ کی کتابیں فراہم کی جاتی تھیں۔ کمزور مریضوں کے لیے ایسی ایکٹنگ کی جاتی تھی، جس سے وہ خوش ہو کر ہنس پڑیں۔ انھیں خوش کرنے کے لیے دیہاتی ناچ پیش کیے جاتے تھے۔ شفاخانے کے نزدیک جو مسجدیں واقع تھیں، ان کے مؤذنوں کو حکم تھا کہ وہ صبح سے تقریباً دو گھنٹے پہلے اذان دے دیا کریں اور اچھے لحن کے ساتھ اشعار پڑھیں تاکہ بیمار خوش ہو جائیں، کیوں کہ بے خوابی اور طویل رات ان کے لیے تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ بیمارستان میں روبہ صحت مریضوں کی فوری شفایابی کے لیے بھی موسیقی کا انتظام تھا۔ انسانی ہمدردی کے یہ خوب صورت نظارے کسی ایک ہسپتال کی چاردیواری تک محدود نہ تھے۔ قرون وسطیٰ کے دوسرے مسلم ہسپتال بھی یہی روح پرور سماں پیش کر رہے تھے۔ اورنہ کے شفاخانے میں دس موسیقار تعینات تھے، جو ساز بجا کر مریضوں کی دل بہلائی کا فرض انجام دیتے تھے۔

ازمنہ وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں بیماروں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ "بیمارستان منصوری" میں عام اجازت تھی کہ اس میں بلاتفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل، ہر مریض داخل ہو سکتا

ہے۔ اس کے وقف نامے میں کہا گیا تھا کہ یہ ہسپتال امرا و غربا' مرد و زن' مقامی و غیر مقامی' بچوں اور بوڑھوں' لڑکے اور لڑکیوں' اجنبی و رشتے داروں' مقیم و مسافر' قوی و ضعیف' عام و خاص' اعلیٰ و ادنیٰ' افسر و ماتحت' بینا و نابینا' افضل و کمتر' مشہور و گمنام' ذی قدر و بے قدر' مالک و مملوک چاہے اُن کا تعلق کسی رنگ و نسل سے ہو' ان کے امراض جسمانی ہوں یا روحانی یا اعصابی' کم ہوں یا زیادہ' ایک جیسے ہوں یا مختلف' ظاہری ہوں یا باطنی سب کے لیے وقف ہے۔ سب کا علاج بلامعاوضہ ہو گا جس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہ علاج محض خدا کے لیے اور آخرت کا اجر حاصل کرنے کی غرض سے اور اس کے احسان عام کی وجہ سے ہو گا' کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ مریض کی بھلائی پر خرچہ کیا جائے اور ان لوگوں پر جو بیماروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وقف نامے میں کہا گیا ہے کہ غریب بیمار چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں' مکمل صحت یابی تک شفاخانے کے اندر داخل رہیں گے' جہاں علاج کی تمام سہولیات ان پر صرف کی جائیں گی اور تمام لوگوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ اس ہسپتال میں علاج کی کوئی مدت مقرر نہ تھی۔ مریض شفایاب ہونے یا مرنے کے بعد ہسپتال سے نکلتا تھا۔ دمشق' قاہرہ' بغداد اور دوسرے شہروں کے شفاخانوں کے دروازے ہر قسم کے مریضوں کے لیے کھلے تھے۔ ہندستان میں فیروز شاہ تغلق کے بنائے ہوئے بڑے شفاخانے میں بلالحاظ رنگ و نسل' مذہب و ملت تمام بیماروں کا علاج یکساں طور پر کیا جاتا تھا۔

عہد وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں مریضوں کو جو سہولیات میسر تھیں' وہ جدید دور کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بھی فراہم نہیں ہوتیں۔ شفاخانوں میں کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی۔ علاج معالجے کا بھارا خرچہ اوقاف سے پورا کیا جاتا تھا۔ ہسپتال کے بیرونی حصے میں نووارد مریض کا سب سے پہلے گہرا معائنہ کیا جاتا تھا۔ مرض اگر ہلکا ہوتا تو اسے نسخہ لکھ کر دیتے اور وہ شفاخانے کی ڈسپنسری سے دوا لے کر چلا جاتا۔ بیماری زیادہ ہوتی تو مریض کا نام و پتا درج کیا جاتا۔ حمام میں اس کے کپڑے اتروا کر ایک مخصوص گودام میں جمع کیے جاتے' پھر اسے شفاخانے کے کپڑے پہنا کر متعلقہ وارڈ میں پہنچا دیا جاتا' جہاں پاک و صاف بستر والا پلنگ الاٹ ہوتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اس کا علاج شروع کرتے تھے۔ دوا اور غذا تجویز ہوتی تھی۔ کھانے میں بکری' گائے' تیتر' مرغ اور دوسرے پرندوں کا گوشت فراہم کیا جاتا تھا۔ روبہ صحت مریض جب مقررہ روٹی اور سالم مرغی ایک دفعہ کھاتا اور اسے ہضم کر جاتا تو اسے تندرست مانا جاتا۔ "بیمارستان احمد ابن طولون" میں "مریض جب مرغ کا شوربا اور ہلکے کھانے لگتا تب اسے گھر جانے کی رخصت ملتی تھی۔ "بیمارستان کبیر دمشق" میں مریضوں کے اخراجات کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ "بیمارستان صلاح الدین ایوبی" میں مریضوں کے لیے شان دار کمرے تھے۔ ہر کمرے میں پلنگ اور اس پر بچھونے اور تکیے رکھے ہوتے تھے۔

شفاخانوں میں بیماروں کو جاڑوں میں گرم کپڑے' کمبل اور کوئلہ فراہم کیا جاتا تھا۔ "منصوری

شفاخانے" میں ناظم وقت کو حکم تھا کہ وہ بیماروں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں' آنکھوں کے استعمال کی اشیا دیگچے' برتن' معجون' مختلف مرہم' تیل' مشروبات' ادویات' فرش' بستر اور ضروری آلات وقف کی آمدنی سے پورے کرے۔ بیماروں کی عام ضروریات بھی شفاخانے ہی کی طرف سے پوری کی جاتی تھیں۔ مریض کے لیے روزانہ جلانے کی خوشبو' کھانے پینے کے لیے رکابیاں' شیشے کے پیالے اور گلاس فراہم کیے جاتے تھے۔ مٹی کی صراحیاں' کوزے اور دیئے جلانے کے تیل' کھانے پینے میں استعمال کے لیے دریائے نیل کا پانی' مریض کے کھانے کو ڈھانپنے کا سامان اور گرمی میں کھجور کے پتوں کے بنے ہوئے پنکھے بھی وقف کی طرف سے ملتے تھے۔

مراکش کے شفاخانے میں بھی مریضوں کو کم سہولیات میسر نہ تھیں' یہاں اون' کتان' ریشم اور چمڑے سے بہترین بستر تیار کرائے گئے تھے۔ بیماروں کے لیے جاڑوں اور گرمیوں میں دن اور رات کے لیے الگ الگ کپڑوں کا انتظام تھا۔ مملکت کے کسی حصے میں بھی کوئی بھی پردیسی اور اجنبی بیمار ہوتا' اسے لاکر ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا۔ "بیمارستان عضدی بغداد" میں کمزور اور فقیر مریض کشتیوں میں لائے جاتے تھے' جہاں ڈاکٹر صبح و شام ان کا علاج کرتے تھے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے طرابلس کے ایک عجیب وقف کا ذکر کیا ہے جس کی آمدنی ایسے دو آدمیوں کے لیے مخصوص ہے' جو ہر روز شفاخانوں میں جائیں اور بیماروں کے پاس آپس میں سرگوشی کے انداز میں اس طرح باتیں کریں کہ مریض سن لے اور وہ ان کی باتوں سے یہ اثر لے کہ اب اس کی حالت بہت اچھی ہو رہی ہے' اس کا چہرہ سرخ معلوم ہوتا ہے اور آنکھوں میں چمک ہے (ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی' اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' ۱۹۸۲ء' ص ۲۲۹)۔

ہندستان میں داخل مریضوں کے لیے انواع و اقسام کے لذیذ کھانے' بہترین میوے اور پھل' قسم قسم کے مشروبات میسر ہوتے تھے' جنھیں دیکھ کر کوئی بھی تندرست آدمی بیمار بن جاتا۔ ۱۴۳۷ء میں ایک سیاح دمشق کے شفاخانے میں لذیذ کھانے دیکھ کر بیمار بن گیا اور اپنا نام مریضوں کے رجسٹر میں درج کرا لیا۔ طبی افسر نے لذیذ کھانے' گوشت' مرغ' مٹھائیاں اور بہترین پھل تجویز کیے۔ لیکن انھیں سیاح کی "اصل بیماری" معلوم ہو گئی تھی۔ تین روز بعد رقعہ لکھ کر بھیجا کہ مہمان صرف تین روز ٹھہر سکتا ہے۔

"بیمارستان منصوری" پوری دنیا میں قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ہسپتال تھا' جس کا احاطہ دہلی کے لال قلعے کے احاطے سے تین گنا بڑا تھا۔ اس میں بیماروں کے لیے ۸ ہزار بستروں کی گنجایش تھی۔ روزانہ ۴ ہزار سے زائد مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ اتنے بڑے ہسپتال میں بھی ناظم وقف کے فرائض میں ایک فرض یہ تھا کہ جو لوگ ہسپتال میں تندرست ہو جائیں' انھیں حسب حال اوسط درجے کا لباس فراہم کیا جائے اور

اس کے ساتھ نقد رقم دی جائے' تاکہ باہر جاکر وہ دوسروں کے محتاج اور دست نگر نہ ہو جائیں۔ دوسرے مسلم شفاخانوں میں بھی دستور تھا کہ مریض جب شفایاب ہونے کے بعد ہسپتال سے چھٹی پاتا تو اسے گھر جانے کے لیے کرایہ اور سفر خرچہ دیا جاتا تھا' جسے زادالسلام کہتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے اتنی رقم دی جاتی تھی' جس میں وہ اپنے گھر پر رہ کر بیماری کے بعد کے کمزوری کے ایام بے فکری سے گزار سکے تاکہ معاشی مجبوری کے تحت اسے فوری طور پر کام کرنا نہ پڑے' جس سے وہ دوبارہ بیمار ہو جائے۔ لباس اور نقدی امیر و غریب سب کو ملتی تھی۔ البتہ غریب آدمیوں کو نہ صرف کمزوری کے ایام گزارنے کے لیے رقم دی جاتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس قدر نقدی فراہم کی جاتی تھی' جس پر وہ اس وقت تک گزارہ کر سکتے تھے' جب تک انھیں روزگار دوبارہ نہ مل جاتا۔ مراکش کا ہسپتال اس معاملے میں سب سے آگے تھا۔ یہاں ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت اغنیا اور فقرا سب کو رقم ملتی تھی۔ البتہ غربا کو اس رقم کے علاوہ اتنا سرمایہ دیا جاتا تھا' جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کر سکتے تھے۔ پردیسیوں کے لیے جو شفاخانے مخصوص تھے' ان میں بھی یہی سہولیات میسر تھیں۔

مسلم بیمارستانوں میں اگر کسی مریض کی موت واقع ہو جاتی تو اس کی تجہیز و تکفین پورے اسلامی آداب کے ساتھ شفاخانے کی طرف سے ہوتی تھی۔ غسل دینے' حنوط لگانے' کفن کے اخراجات اور قبر کھودنے کی اجرت شفاخانے کے وقف سے ادا کی جاتی تھی۔ میت کو سنت نبویؐ کے مطابق باعزت طور پر دفن کیا جاتا تھا۔ قاہرہ کا "بیمارستان منصوری" تمام مسلم شفاخانوں کے لیے انسانی ہمدردی کی قابل رشک مثال پیش کر رہا تھا۔ اس ہسپتال میں خارجی بیماروں کے لیے بھی بڑے پیمانے پر سہولیات فراہم تھیں۔ اس کے وقف نامے میں ناظم اوقاف کو ہدایت کی گئی تھی کہ جو آدمی اپنے گھر میں بیمار ہو اور ہسپتال میں علاج کرانے سے لاچار ہو' اسے جس دوا' شربت یا معجون کی ضرورت ہو وہ اس کے گھر پہنچا دے۔ اگر کوئی ایسا خارجی مریض اپنے گھر میں مر جائے تو ناظم اس میت کے شایان شان اس کی تجہیز و تکفین کے اخراجات' غسل دینے' قبر کھودنے اور قبرستان تک پہنچانے کی اجرت شفاخانے کے وقف سے ادا کرے۔ یہ وہ ہدایات تھیں' جن سے سرمو انحراف نہیں ہوتا تھا' بلکہ اگر ناظم اوقاف چاہتے تو سہولیات کا دائرہ بڑھا سکتے تھے۔ یہ ان کی صوابدید پر منحصر تھا۔ وقف نامے میں کہا گیا تھا کہ ناظم کا فرض ہے کہ ظاہری اور باطنی حالات میں اللہ سے ڈرے' کسی بڑے آدمی کے ساتھ نچلے طبقے کے آدمی سے بہتر سلوک نہ کرے' نہ اپنے ملک کے باشندے کو غیر ملکی پردیسی پر ترجیح دے' بلکہ خرچ میں ثواب اور اللہ کے قرب کا لحاظ رکھے جو رب الارباب ہے (تفصیل کے دیکھیے: احمد عیسیٰ بک' تاریخ البیمارستانات فی الاسلام' دمشق' ۱۹۳۹ء)۔

(قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے کا ایک باب)

حواشی

۱- تیرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے ملنسیہ کی مقامی بولی میں ہسپتال کا ترجمہ "مرستان" اور "ملنستان" رائج ہے۔ ہسپانوی بولیوں میں اور گیارھویں صدی ہجری کے قاہرہ میں بھی "مرستان" کا لفظ رائج ہوا۔ آج کل قاہرہ میں اس کا تلفظ "مُرستان" ہے۔ المغرب کی جدید بولیوں میں "مورسطانی" اور بعض جگہ "موسطران" استعمال ہوتا ہے اور پورے المغرب میں اس کے معنی خطرناک پاگلوں کا قیدخانہ ہے۔ دیکھیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ' ج ۵' ص ۳۰۹۔ عربی میں آج کل شفاخانے کے لیے مستشفی کا لفظ آتا ہے۔ مارستان یا مارستانی پاگل خانے کے لیے مروج ہے۔

۲- حکیم نیر واسطی صاحب کے بیان کے مطابق ابوسعید یمامی نے اطبا کے امتحان کے لیے ایک کتاب تیار کی تھی۔ اس میں طبیبوں کے علم' تجربے اور لیاقت کے پیش نظران کے درجات مقرر کیے گئے تھے اور امتحان کے طریقے اور قواعد پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان کے بعد عبدالعزیز مسطبب نے امتحان الالباء س کافة الاطبا تحریر کی جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں نبض' قارورہ' حمیات و نجاریں' صحت و مرض کی علامات جیدہ و مخوفہ' علم ادویہ' علم مداواۃ' علم مسائل اصول کے ابواب ہیں۔ ہر باب میں ۲۰' ۲۰ سوالات اور ان کے جوابات دیے ہیں' تین ابواب جراحوں' کحالوں اور مجبروں سے متعلق ہیں۔ ان میں ۲۰' ۲۰ سوالات اور ان کے جوابات ہر باب کے ذیل میں درج ہیں۔ دیکھیے: طب العرب' ص ۲۸۸-۲۹۱)

اخبار امت

جنوبی لبنان سے اسرائیلی افواج کا انخلا

محمد ایوب منیر

۲۴ مئی ۲۰۰۰ء کو اسرائیلی افواج نے جنوبی لبنان کے وہ علاقے خالی کر دیے ہیں جن پر ۱۹۷۸ء میں فوج کشی کے ذریعے اس نے قبضہ جما لیا تھا۔ ۲۲ برس تک قابض رہنے کے بعد سرحدی علاقے میں پھیلے ہوئے سیکڑوں دیہات اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر۴۲۵ کے زیر اثر نہیں بلکہ حزب اللہ ملیشیا کے تابڑ توڑ حملوں اور پسپا نہ ہونے والے چھاپہ ماروں کی کارروائیوں سے زچ ہو کر خالی کیے ہیں۔ قیام اسرائیل (۵ مئی ۱۹۴۸ء) کے بعد تل ابیب حکومت نے اپنے سیاسی فیصلے بھی منوائے ہیں اور عرب افواج کو بارہا شکست سے دوچار بھی کیا ہے تاہم حزب اللہ ملیشیا کے جوش و جذبے نے جو کام کیا ہے وہ تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک کی افواج نصف صدی میں بھی نہیں کر سکیں۔ جنوبی لبنان میں تکبیر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں اور حزب اللہ کے کمانڈر اور چھاپہ مار شایان شان استقبال سے سرفراز کیے جا رہے ہیں۔ حزب اللہ کے سربراہ حسن نصراللہ نے اعلان کیا ہے کہ ہماری جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اسرائیل کی جیلوں سے لبنانی قیدیوں کو رہا نہیں کر دیا جاتا اور شیبافارم کے علاقے لبنان کو واپس نہیں کر دیے جاتے۔ اسرائیل نے افواج مجبوری سے واپس بلائی ہیں' شوق سے نہیں۔ اگر افواج واپس نہ جاتیں تو حزب اللہ ملیشیا اسرائیلی سرحد عبور کر کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کر لیتی۔

اسرائیل کے خلاف حزب اللہ کی ۲۰ سالہ جدوجہد اور کامیابی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلم حکمران ایک راستہ اختیار کرتے ہیں اور مسلم عوام دوسرا۔ قضیہ فلسطین میں اور اسرائیل کے ساتھ تنازعے میں عرب حکمران مجموعی طور پر یہی سمجھتے رہے کہ اسرائیل تو ناقابل شکست ہے اور مذاکرات کے ذریعے ہی کوئی راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ گذشتہ ۵۲ برسوں میں خلیج کے دولت مند ملکوں کی تربیت یافتہ اور جدید اسلحے

سے لیس افواج کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کہ اسرائیلی افواج کو شکست سے دوچار کریں۔ چند ہزار نیم تربیت یافتہ رضاکاروں نے لبنان کے دیہاتوں کی غریب آبادی کی سرپرستی سے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جو علاقے کی سیاسی قیادت کو نئے فیصلے کرنے پر مجبور کر دے گا اور امت مسلمہ کی سرخروئی کا راستہ کھلے گا۔

امریکہ کی حکومت عرصہ دراز سے اسرائیل کو ۳ ارب ڈالر سالانہ کی امداد مختلف منصوبوں کی تکمیل کے لیے فراہم کرتی چلی آ رہی ہے۔ جنوبی لبنان خالی کرنے' نیز شام و فلسطین کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے انعام کے طور پر ۳۳ کروڑ ڈالر ہدیے کا مزید اعلان کیا گیا ہے (امپیکٹ' جون ۲۰۰۰ء)۔ اسرائیل کے سرپرست' امریکی ذرائع ابلاغ نے اسرائیل کی شرمناک اور ذلت آمیز پسپائی کو دفاعی طرز عمل قرار دے کر اس کی ہتک کو بھی تدبیر قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اسرائیل جو عالمی اداروں کی قراردادوں کے سرعام پرزے بکھیرتا رہا ہے' جس نے تمام متفقہ معاہدوں کے باوجود فلسطینی علاقوں پر قبضہ جمائے رکھا ہے' جس نے عرب دارالحکومتوں پر بم باری کی ہے' جس نے صرف لبنان میں ۲۰ ہزار سے زائد معصوم' نہتے شہریوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں' جس نے اپنی فضائی افواج سے علاقے کو یرغمال بنا رکھا ہے' اس کی شکست کو جنگی تدبیر (tactical move) قرار دینا یہ ثابت کر رہا ہے کہ ظلم' زیادتی' تشدد' قتل اور حقوق انسانی کی پامالی کے جو ریکارڈ اسرائیل نے قائم کیے ہیں وہ واشنگٹن کے ڈیموکریٹ اور ری پبلکن حکمرانوں کی براہ راست سرپرستی کے بغیر ممکن نہ ہو سکتے تھے۔

صدر کلنٹن مشرق وسطیٰ پالیسی کے حوالے سے اپنے تین نکات بارہا بیان کر چکے ہیں' یعنی عراق میں صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ' ایران سے دیرپا تعلقات کی بحالی اور تحریک آزادی فلسطین کو کسی نہ کسی طرح اسرائیل کے حق میں معاون بنا دینا۔ تیسرے مسئلے میں امریکہ کی کامیابی کوئی راز نہیں ہے۔ امریکہ کے اشارے پر اردن کی حکومت پورٹ عقبہ کے قریب ایک جدید ایئرپورٹ تعمیر کر رہی ہے۔ اردن اسرائیل معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں اور اسرائیلی سول و فوجی انتظامیہ اس ایئرپورٹ کو اپنے دشمنوں کے خلاف باآسانی استعمال کر سکے گی۔

برطانوی جریدہ اکانومسٹ ۲۷ مئی کی اشاعت میں فرار ہونے والے اسرائیلی فوجی دستوں کی روداد یوں قلمبند کرتا ہے:

> ایہود باراک کے مسلسل تردیدی بیانات کے باوجود' یہ بات یقینی ہے کہ اسرائیلی دستے اس حالت میں جنوبی لبنان سے بھاگے گویا (جانور کی) دم ٹانگوں میں پھنس گئی ہو۔ فوجی دستے اس عالم میں علاقے خالی کرتے دکھائی دیے کہ ان کے چھوڑے ہوئے عسکری سازوسامان کی حفاظت فضائیہ کر رہی تھی۔ حاؤلہ کے نزدیک' دیہاتیوں نے ایک فوجی ٹینک دکھایا جو سڑک پر بے یارومددگار

کھڑا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹینک پر سوار فوجی ٹینک سے کودے اور چند سو گز کے فاصلے پر اسرائیل کی سرحد میں دوڑتے ہوئے داخل ہو گئے۔ بعدازاں اسرائیلی ہیلی کاپٹروں نے اس ٹینک پر حملہ کر کے اسے ناکارہ بنا دیا تاکہ یہ حزب اللہ کے کمانڈوز کے ہتھے نہ چڑھ سکے۔

جنوبی لبنان میں سفر خطرے سے خالی نہیں۔ جگہ جگہ لبنانی نوجوان' اسرائیل کے چھوڑے ہوئے فوجی اسلحے کو چلانا سیکھتے نظر آئیں گے۔ اس اسلحے کو چلانے والے جنوبی لبنانی فوج (SLA) کے فوجی تھے۔ یہ ملیشیا اسرائیل نے اس علاقے میں کھڑی کی تھی۔ مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو گاڑیوں کے ڈھانچے بھی لبنانی سرحد کے اندر نظر آ رہے ہیں۔ امید ہے پچھلے پندرہ برس سے خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنے والے اقوام متحدہ کے سوا چار ہزار متعین فوجی' اپنے گھروں کو واپس جا سکیں گے۔

کینیڈا سے شائع ہونے والا جریدہ کریسنٹ (یکم جون ۲۰۰۰ء) اسرائیل کی شکست کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> شیبا فارم سے گولان پہاڑیوں کے قرب و جوار تک شام' لبنان اور مقبوضہ فلسطین کی سرحدیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں اور جنوب میں بحیرۂ روم کے قریب حامرا گاؤں تک حزب اللہ نے مسلسل فوجی کارروائیاں جاری رکھیں' ۲۲ مئی کو خطہ سلامتی پر کارروائی کی اور اسرائیلی افواج کی ایک نہ چلی تو وزیراعظم ایہود باراک نے اپنی جنگی کابینہ کا فوری اجلاس طلب کیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ افواج کا انخلا قبل ازیں ہی کر لیا جائے۔ اس سے پہلے کا فیصلہ یہ تھا کہ جولائی کے وسط میں افواج واپس بلا لی جائیں گی۔ باراک نے حکم دیا کہ یکم جون تک افواج واپس آجائیں لیکن اسرائیلی دستے اس بری طرح گھر چکے تھے کہ ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر علاقہ خالی ہو گیا۔ اس عبرت ناک شکست کو چھپانے کے لیے باراک نے واپس آنے والے دستوں کا استقبال ان الفاظ میں کیا: "آج ۱۸ سالہ خلفشار اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے"۔
>
> ظاہر ہے شکست کے موقع پر ایسی ہی لفاظی کی جاتی ہے۔

یاسر عرفات نے محدود آزادی کے نام پر فلسطینی سرزمین سے دستبرداری اور اسرائیل سے دوستی کا جو طوق ملامت اپنے گلے میں ڈالا' حزب اللہ کی فتح نے ثابت کر دیا ہے کہ یاسر کا موقف غلط اور حماس کا موقف درست ہے۔ حماس کے ترجمان ابراہیم غوشے نے حزب اللہ کو مبارک باد دی ہے اور کہا ہے کہ ہم اسی نمونے کی پیروی کریں گے۔ مقبوضہ علاقے کے محکوم لوگوں نے ثابت کر دیا ہے کہ حقوق کی بحالی اور زمین کی بازیابی کا واحد راستہ مزاحمت ہے۔ دنیا بھر میں اس عظیم الشان فتح پر شادمانی کا اظہار ہونا چاہیے۔

حزب اللہ کا قیام ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں عمل میں آیا۔ اسے ایران اور شام کی پشت پناہی حاصل رہی۔ اسرائیل نے اردن سے مشرقی کنارہ چھینا' شام سے گولان کی پہاڑیاں چھین لیں' مصر سے صحرائے سینا

چھین لیا اور فلسطین کی مقدس سرزمین پر قبضہ تو پہلے ہی کر لیا تھا۔ حزب اللہ نے اول روز ہی سے یہ موقف اختیار کیا کہ اسرائیلی قبضہ ناجائز ہے۔ ان علاقوں کی واگزاری فرض اولین ہے۔ زمین کی بازیابی کے لیے وہ تمام حربے استعمال کیے جا سکتے ہیں جو غاصب دشمن استعمال کر رہا ہے۔ حزب اللہ کے لیے مثال اور نمونہ' اسلامی تحریک مزاحمت فلسطین حماس اور اس کے قائد شیخ احمد یاسین بھی ہیں جن کا شعار ہے کہ سرزمین مقدس فلسطین سے آخری یہودی کے انخلا تک ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ حزب اللہ نے عزم و استقلال کی لاتعداد داستانیں رقم کی ہیں تاہم شیخ حسن نصراللہ کی قیادت ہی میں انھیں یہ عظیم الشان عسکری کامیابی نصیب ہوئی ہے' اور حزب اللہ عالم اسلام کے مجاہدین کی طرف سے اور جملہ مومنین کی طرف سے مبارک باد کی مستحق ہے۔

حزب اللہ کی جدوجہد عالمی قانون کے عین مطابق ہے۔ اقوام متحدہ نے لبنان کی سرزمین پر اسرائیل کے قبضے کو عالمی سرحد کی خلاف ورزی اور ناجائز تسلط قرار دیا تھا اور قرارداد نمبر ۴۲۵ کے ذریعے تل ابیب سے مطالبہ کیا تھا کہ اس سرزمین کو فی الفور خالی کر دے۔ اسرائیل نے فلسطین کے بارے میں اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو رد کیا۔ اسی وطیرے پر چلتے ہوئے اس نے اقوام متحدہ کی لبنان کے بارے میں قراردادوں کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی' نتیجتاً اسے عالمی برادری کے سامنے شرمسار ہونا پڑا' اور ایہود باراک کو اندرونی طور پر بھی طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اسرائیل کا مقابلہ نہ کرنے اور اس سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کے سلسلے کا آغاز مصر کے صدر انورالسادات نے کیا تھا۔ بعدازاں شام کے حافظ الاسد' اردن کے شاہ حسین' فلسطین کے یاسر عرفات اور مصر کے موجودہ صدر حسنی مبارک نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ بلاشک و شبہ واشنگٹن کے زیرسایہ اوسلو معاہدے کے ذریعے فلسطین کے دو شہروں غزہ اور مغربی کنارے کی خودمختاری کا فیصلہ ہوا لیکن عالم اسلام اور عالم عرب کے قلب میں پیوستہ اسرائیلی خنجر کے وجود کے خاتمے کی کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ عراق پر امریکہ نے جو جنگ مسلط کی' اس نے یہ ثابت کر دیا کہ مغربی برادری' اسرائیل کو تحفظ دینے کے لیے کسی بھی کارروائی پر اتر سکتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ربڑسٹمپ ادارے نے آج تک کوئی ایسا حل نافذ نہیں کیا جس سے امت مسلمہ کے بڑے مسائل میں سے کوئی مسئلہ حل ہوتا ہو۔

حزب اللہ کے چار' سوا چار ہزار نیم تربیت یافتہ رضاکاروں نے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا ہے کہ جو فیصلہ میدان جنگ میں ہو سکتا ہے' وہ مذاکرات کی میز پر نہیں ہو سکتا۔ فلسطین کی حماس اور جموں و کشمیر کی حزب المجاہدین کو یہ حقیقت ہر دور میں سامنے رکھنی چاہیے۔

فضیلت پارٹی کے انتخابات

حافظ محمد ادریس

کسی ملک کی تحریک اسلامی کے داخلی انتخابات کبھی اخبارات کا موضوع نہیں بنتے۔ ترکی میں بھی اس سے پہلے رفاہ پارٹی کے اپنے انتخابات میں نہ کوئی امیدوار ہوتا تھا' نہ کوئی مدمقابل حریف' کوئی انتخابی گھما گھمی نہ ہوتی تھی' نتائج کا اعلان ہو جاتا تھا۔ لیکن اس دفعہ صورت حال مختلف تھی۔ سیاسی قانون کے مطابق نئی پارٹی کے لیے تین سال کے اندر انتخابات کروانا لازمی تھا۔ رفاہ پارٹی پر پابندی کے ساتھ ساتھ اس کے نمایاں لیڈر نجم الدین اربکان اور طیب اردوگان پر بھی پابندی لگائی گئی تھی۔ نئی پارٹی فضیلت پارٹی بنائی گئی۔ اس نے قومی انتخابات میں حصہ لیا اور ۱۱۰ نشستیں حاصل کیں۔ آج مخلوط حکومت کی حقیقی اپوزیشن پارٹی یہی ہے۔ اس پارٹی کے اپنے انتخابات نہ صرف ملکی بلکہ عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا بھی مرکز تھے۔ انتخابی اجلاس کی رپورٹنگ کے لیے ۳۹۷ نمایندوں میں سے ۶۳ غیر ملکی تھے۔ انتخابات میں صدر کے علاوہ ۵۰ اراکین جنرل کونسل اور ۱۱ مجلس عاملہ کے اراکین کا انتخاب بھی ہوا تھا۔ قانون کے مطابق ان انتخابات میں مندوبین کھلے اجلاس میں عہدیداروں کو منتخب کرنے کے مکلف ہیں۔ تحریک اسلامی کے وابستگان کے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ انتخابی کش مکش کے کیا اثرات بعد میں کارکردگی پر پڑ سکتے ہیں؟ جن دوسرے ممالک میں سرکاری الیکشن کمیشن پارٹیوں کے انتخابات لازمی قرار دے رہا ہے' کیا وہ ان کے قواعد و ضوابط بھی طے کرے گا؟

فضیلت پارٹی میں بحیثیت مجموعی فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے مگر ہر انسانی جماعت اور معاشرے کی طرح بعض معاملات میں اختلاف رائے بھی موجود ہے۔ پارٹی کے اندر بیشتر لوگ پروفیسر اربکان ہی کو مرجع تصور کرتے ہیں مگر بعض لوگوں کی رائے میں نوجوان قائد رجب طیب اردوگان مستقبل کے انقلابی لیڈر ہیں۔ اربکان اور اردوگان دونوں پابندی کی وجہ سے براہ راست سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔

انتخابی میدان میں تین گروہ سرگرم عمل تھے:

رجائی قوطان (عمر ۷۰ سال) جو پارٹی کے صدر تھے اور سابقہ ادوار میں وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سیاست دان ہیں جو پیشے کے لحاظ سے ہائیڈرالک انجینیر ہیں۔ انھیں نجم الدین اربکان کی حمایت حاصل تھی۔

عبداللہ گل (عمر ۵۲ سال) ماہر اقتصادیات اور پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ نجم الدین اربکان کے قریبی لوگوں میں سے ہیں۔ ان کے نائب اور سابقہ حکومتوں میں وزیر رہ چکے ہیں۔ صدر رجائی قوطان کے نائب

بھی تھے مگر انتخابات سے قبل انھوں نے پارٹی کی نائب صدارت سے استعفا دے دیا تھا۔ انھیں طیب اردوگان کی تائید حاصل تھی۔

بلند ارینش، یہ تحریک کے قدیم اور ابتدائی رہنماؤں میں سے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اربکان صاحب کے ساتھ ان کے قرب کی وجہ سے انھیں عموماً اربکان جونیئر کہا جاتا تھا۔ ان کا بھی طویل پارلیمانی تجربہ ہے۔ انتخابات سے قبل بلند ارینش نے اپنا ارادہ بدل لیا اور صدارت کا انتخاب لڑنے کے بجائے عبداللہ گل کی حمایت کا اعلان کیا اور ان کے گروپ میں شامل ہو گئے۔ یوں یہ دو گروپ مل کر خاصے مضبوط ہو گئے۔

قانون کے مطابق ترک پارلیمنٹ کی نشستوں سے دگنے افراد انتخاب میں اپنا ووٹ ڈالتے ہیں۔ ہر حلقے سے دو مندوب چنے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ کی ۶۱۸ نشستیں ہیں۔ اس طرح ۱۲۳۶ مندوبین انتخابی ہال میں موجود تھے۔ انتخاب میں ووٹ دینے کا حق تو مندوبین کو حاصل تھا مگر ۱۴ مئی ۲۰۰۰ء کو انقرہ کے سپورٹس اسٹیڈیم میں انتخابی جلسہ ہوا جس میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

عمومی فضا عبداللہ گل کے حق میں تھی۔ میڈیا کے اکثر نمایندگان بھی ان کے طرف دار تھے، مگر مندوبین کے علاوہ ہال کے اندر اور باہر پارٹی کے ۲۵ سے ۳۰ ہزار کارکنان بھی موجود تھے جن کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ پوری دنیا کی نظریں پارٹی کے انتخابات پر لگی ہوئی تھیں۔ حاضرین میں سے بیشتر کے ہاتھوں میں عبداللہ گل کی بڑی بڑی تصاویر اور کتبے تھے۔ انتخاب سے قبل حاضرین کے درمیان نعروں کا بھی خوب مقابلہ ہوا۔ نعروں میں گل کے حامیوں کا پلہ بھاری تھا۔ انھوں نے صبح سویرے ہی سے سٹیج کے قریب ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

رجائی قوطان اور عبداللہ گل نے الیکشن کے انعقاد سے پہلے تقاریر کیں۔ رجائی کی تقریر میں ٹھہراؤ اور سکون تھا جب کہ گل کی تقریر جوش خطابت کا نمونہ تھی۔ پارٹی اور ملک کو کس انداز میں چلایا جائے گا، دونوں لیڈروں نے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا مگر محتاط الفاظ میں دونوں نے نام لیے بغیر اربکان کا احترام اور ان کی طے کردہ پالیسیوں کو جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔

عبداللہ گل ایک پُرکشش شخصیت کا حامل سیاسی لیڈر ہے جس کی سیاسی زندگی میں کامیابیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ وہ پُرکشش شخصیت کا حامل لیڈر ہونے کے علاوہ شعلہ نوا خطیب بھی ہے۔ اس نے درپیش مسائل کے لیے ایک متحرک اور جاذب نظر قیادت کی ضرورت پر زور دیا۔ عربی اور انگریزی پریس کی رپورٹوں کے مطابق اس کی تقریر کے دوران بہت پُرجوش نعرے لگتے رہے۔ بلند ارینش کے عبداللہ گل کے ساتھ اتحاد اور عوامی جوش و خروش کو دیکھ کر بہت سے مبصرین یہ خیال کر رہے تھے کہ نوجوان قیادت میدان مار لے گی۔

انتخابات کے دوران ایک واقعہ نے پورے مجمع کو مسحور کر دیا۔ اربکان ایسے کسی اجتماع میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس موقع پر بظاہر غائب تھے مگر فی الحقیقت لوگوں کے دلوں میں موجود تھے۔ کانفرنس کی کارروائی میں بیس منٹ کا وقفہ کیا گیا۔ اس دوران اسکرین پر اربکان کی تصویر اور پیغام نمودار ہوا۔ یہ لمحات یادگار تھے۔ ہزاروں کا مجمع کھڑا ہو گیا اور پورا ماحول "مجاہد اربکان' مجاہد اربکان" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ بیس منٹ تک یہ نعرے گونجتے رہے۔ فرط جذبات سے لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اربکان نے اپنے مختصر پیغام میں سب کو سلام اور نیک تمناؤں کا پیغام دیا اور قافلے کے بخیریت منزل تک سفر کی دعا کی۔ پارٹی کے مخالف صحافیوں کا بے ساختہ (اور غالباً درست) تبصرہ تھا: "اربکان کامیاب ہو گیا ہے' یہ تو اربکان ہی کا شو تھا..."۔

مندوبین نے تقاریر سننے کے بعد ووٹ ڈالے۔ جب نتائج مرتب ہو رہے تھے' اس وقت ہال میں سناٹا تھا۔ نتائج کا اعلان ہوا تو اتنے بڑے مجمع نے اپنے منظم اور سیاسی لحاظ سے بالغ نظر ہونے کا ثبوت دیا' نہ کوئی ہنگامہ' نہ مخالفانہ فقرے بازی! نتائج کے مطابق رجائی قوطان اور ان کے گروپ کے جنرل کونسل کے پچاس ارکان اور ایگزیکٹو کمیٹی کے ۱۱ عہدہ داران اکثریت سے کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کو ۶۳۳ ووٹ ملے اور عبداللہ گل اور ان کے ساتھیوں کو ۵۲۱ جب کہ ۴۸ ووٹ مسترد اور ۳۴ غیر حاضر قرار پائے۔ کامیاب پینل نے ۵۰ فی صد سے زائد ووٹ حاصل کر لیے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دوسرا راؤنڈ ہوتا۔

عبداللہ گل اور ان کے ساتھیوں کو اتنی بڑی پذیرائی ملنا معمولی بات نہ تھی مگر نتائج کے بعد عبداللہ گل نے اپنی تقریر میں رجائی قوطان کو اپنا لیڈر تسلیم کیا اور خود کو ان کا سپاہی اور کارکن قرار دے کر ہر حکم کی تعمیل کا عزم ظاہر کیا۔ رجائی قوطان نے بھی مدبرانہ تقریر کی اور پارٹی کے تمام عناصر کو ایک ساتھ منزل تک لے جانے کا اعلان کیا۔

اس کانفرنس کی صدارت اور انتخابات کی نگرانی پارٹی کے اہم رہنما اور ممبر پارلیمنٹ یاسین الیتولو نے کی۔ انتخابی نتائج کے بعد تمام لوگوں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو شخص کوئی بات کرنا چاہے اس کے لیے پورا موقع ہے' مگر دونوں لیڈروں کی اختتامی تقاریر پر ہی یہ اہم کانفرنس اختتام پذیر ہوئی اور سب لوگ نئے جذبہ عمل اور اطمینان قلب کے ساتھ ہال سے رخصت ہو گئے۔

نومنتخب صدر رجائی قوطان نے ایک تازہ انٹرویو میں مخالفانہ ابلاغی پراپیگنڈے پر معذرت خواہانہ موقف اپنانے کے بجائے کھل کر کہا ہے کہ ترکی کے گمبھیر مسائل کو فضیلت پارٹی کی حکومت کے برسر اقتدار آئے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کے حوالے سے ایک سوال پر بھی انھوں نے ترکی کی تمام سیکولر جماعتوں اور میڈیا کے دباؤ اور اسرائیل کے بے پناہ اثرات اور تسلط کے باوجود پوری جرأت کے

ساتھ کہا کہ اسرائیل نے علاقے میں جارحیت کی پالیسی اختیار کر کے فضا مکدر کر رکھی ہے۔ کسی بھی غاصب کی حمایت بنیادی انسانی اخلاق و اقدار کی نفی ہے۔

اس انتخاب کے بعد فضیلت پارٹی ترکی کے ہر فرد کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ ساڑھے چھ کروڑ آبادی کا یہ ملک، جس کا شاندار ماضی تاریخ میں جگمگا رہا ہے، ملت اسلامیہ کے لیے روشن مستقبل کا ان شاء اللہ نقیب ثابت ہو گا۔ ساری دنیا میں تحریک اسلامی اس سرزمین پر سب سے زیادہ مضبوط، منظم اور مقبول ہے۔ ترکی سے تازہ ہوا کے جھونکے چاردانگ عالم میں محسوس کیے جاتے رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان انتخابات کے اثرات فضیلت پارٹی کے آیندہ منصوبوں اور کارکردگی پر کیا پڑتے ہیں۔ ہر طرح کے تبصرے کیے جا رہے ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی میڈیا میں اچھالا گیا ہے کہ کیا دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکیں داخلی سطح پر اسی انداز کی کھلی جمہوریت کی روایت کو آگے بڑھائیں گی؟

رسائل و مسائل

زکوٰۃ پر رشتے داروں کا حق

سوال: میری ایک بہن اور ایک نند بہت ضرورت مند ہیں (زکوٰۃ کی مستحق ہیں)۔ چونکہ میرا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اس حوالے سے میں اعانت بھی دیتی ہوں اور اپنی محدود حیثیت کے مطابق کتابوں یا کیسٹوں کی شکل میں انفاق بھی کرتی ہوں۔ کبھی اللہ توفیق دے تو کوئی چھوٹا موٹا زیور کشمیر فنڈ میں یا کتابوں کی مد میں دیتی ہوں۔ میں نے یہ سنا ہے کہ رشتے داروں کو چھوڑ کر کہیں اور انفاق کرنے یا زکوٰۃ دینے سے وہ قبول نہیں ہوتی۔ آپ یہ بتائیں کہ اعانت اور دوسری چیزوں پر جو رقم انفاق کی حیثیت سے خرچ کرتی ہوں کیا وہ بھی اپنی نند اور بہن کو دیا کروں' جب کہ زکوٰۃ میں پہلے ہی انھیں دیتی ہوں؟

میری محدود آمدنی ہے اور اس سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ فی سبیل اللہ بھی کروں اور رشتے داروں کو زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ دوں۔ اس لیے درج ذیل سوالات کی وضاحت فرما دیں:

۱۔ کیا ان دونوں مستحقین کی موجودگی میں میرا کسی اور مد میں انفاق درست نہیں ہے؟

۲۔ کسی ایک کی مدد کرنا ہو تو نند اور بہن میں سے کس کو ترجیح دوں؟

۳۔ زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی چیزیں خرید کر انھیں تحفتاً بھجواتی ہوں لیکن یہ ظاہر نہیں کرتی کہ یہ زکوٰۃ کی رقم سے لی گئی ہیں۔ کیا یہ بتانا ضروری ہے؟

۴۔ جان کے صدقے کے لیے فی سبیل اللہ یعنی کیسٹوں' کتابوں' رسائل کی مد میں خرچ کیا جا سکتا ہے؟

۵۔ کیا بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں زکوٰۃ سے اسکول کی فیس' یونی فارم' کتابیں وغیرہ میں مدد کی جا سکتی ہے؟

جواب: یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ زکوٰۃ و صدقات باقاعدگی سے ادا کر رہی ہیں اور اس سلسلے میں اپنے رشتے داروں کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ زکوٰۃ او دوسرے نفلی

صدقات اپنی بہن اور نند کو دیتی رہیں۔ آپ کے علاوہ دوسرے صاحب استطاعت رشتے داروں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کا خیال رکھیں۔ زکوٰۃ و صدقات سے ان کی اعانت کریں۔ اگر اس سے ان کا گزارہ ہو سکتا ہے تو فبہا' ورنہ سب کو مل کر مزید اعانت کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ رشتے داروں کے ضروری اخراجات مال دار رشتے داروں کے ذمے ہیں۔

زکوٰۃ کا کچھ حصہ جہاد فی سبیل اللہ یعنی دعوت دین اور اقامت دین کی مد میں بھی دینا چاہیے اور رشتے داروں کی مزید اعانت اپنے مال سے بھی کرنی چاہیے۔ جس قدر زکوٰۃ کا حصہ جہاد کی مد میں دیا جائے اسی قدر اعانت اپنے مال سے رشتے داروں کی کرنی چاہیے۔ کچھ اپنے اوپر مزید بوجھ بھی ڈالنا چاہیے۔ اس طرح کرنے سے تمام حق داروں کا حق ادا ہو جائے گا۔

مذکورہ اصولوں کی روشنی میں آپ کے پانچ سوالات کا جواب بھی آ جاتا ہے جو درج ذیل ہے:

۱- ان دو مستحقین کی موجودگی میں آپ ان کو دوسروں پر ترجیح دیں۔ البتہ اقامت دین کے کام کے لیے کچھ حصہ ان لوگوں تک بھی پہنچانا چاہیے جو اقامت دین کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں اور اس سے ان کے حصے میں جو کمی آئے' اسے مال زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مال سے یا رشتے داروں کے مال سے پورا کریں۔

۲- بہن کو نند پر ترجیح حاصل ہے۔ اگر آپ کے پاس دینے کے لیے ایک چیز ہو تو بہن کو مقدم رکھیں۔

۳- زکوٰۃ کی ادایگی کے لیے' ادا کرنے والے کی نیت ہی کافی ہے۔ جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے' اس کے لیے اس کا علم ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے جس طرح سے زکوٰۃ دے رہی ہیں' دیتی رہیں' لیکن یہ بھی نہ کہیں کہ یہ تحفہ ہے۔ یہ کہیں کہ یہ آپ کا حق ہے جو میرے مال میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے رکھا ہے' وہ آپ تک پہنچا رہی ہوں۔

۴- صدقہ فقرا و مساکین اور دین کے کاموں کی مالی اعانت کا نام ہے۔ دینی کتابیں اور جہاد فی سبیل اللہ بھی صدقے کا مصرف ہے۔ اس لیے آپ کتابیں لے کر دے دیں تو صدقہ ادا ہو جائے گا۔ جان کا صدقہ بکرا ذبح کرنا نہیں ہوتا بلکہ مذکورہ کاموں کی مالی اعانت ہوتی ہے۔

۵- جو بچے زکوٰۃ و صدقات کے مستحق ہوں انھیں تعلیمی ضروریات اور یونی فارم وغیرہ کے لیے بھی زکوٰۃ دے سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہ ہوں تو پھر اسکول کی یونی فارم اور کتابوں وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں لگتی (مولانا عبدالمالک)۔

اسلام' محض سنہرا خواب؟

محترم خرم مرادؒ نے جماعت اسلامی لاہور کی امارت کے دور میں جماعت کا ایک تعارف لکھا تھا جو بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ اس پر ایک ساتھی نے اپنا تاثر لکھا جس کا انھوں نے جواب دیا۔ یہ ہم شائع کر رہے ہیں۔ جواب سے ہی سوالات کی وضاحت ہو جاتی ہے (ادارہ)۔

ج : میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری تحریر "آپ جماعت اسلامی کا ساتھ کیوں دیں؟" پر اپنے خیالات کا صاف گوئی کے ساتھ اظہار کیا۔

آپ نے اس تحریر کو مبہم اور غیر ضروری معاملات پر مشتمل سمجھا ہے۔ آپ غور کریں تو بحیثیت مسلمان' امت مسلمہ کے مشن اور مقصد اور بنیادی فریضہ کو ادا کرنے کا پیغام' نہ مبہم ہے' نہ غیر ضروری۔ اگر کوئی فریضہ نماز کی ادائیگی کی دعوت دے تو نہ یہ مبہم ہے نہ غیر ضروری۔ یہی حیثیت اقامت دین کی دعوت کی ہے۔ اب یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ اس میں کیا بات غیر ضروری ہے یا غیر واضح۔ دوسری بات اس ملک و قوم کے امراض کی نشان دہی ہے۔ وہ بھی بہت واضح ہے اور ضروری امر ہے۔

اسلامی نظام کے ذریعے عام آدمی کے مسائل حل کرنے کی منزل کو آپ نے سنہری خواب سمجھا ہے۔ اول تو سنہری خواب دیکھے بغیر نہ فرد کوئی بڑا کام کر سکتا ہے' نہ جماعتیں اور قومیں۔ جب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی کا خواب دیا تو ان کو بھی وہ سنہرا خواب ہی نظر آیا تھا۔ جب رسولؐ اللہ نے خانہ کعبہ میں اس دور کی پیش گوئی کی تھی' اور اس وقت لوگ بھی مٹھی بھر تھے اور طریق کار بھی غیر معلوم' کہ ایک عورت عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرے گی اور اس کو اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا' یا جب آپؐ نے سراقہ کو کسریٰ کے کنگن پہننے کی بشارت دی تھی' یا جب عدی بن حاتم سے یہ کہا تھا کہ ایک شخص سونا ہاتھ میں لے کر نکلے گا اور کوئی لینے والا نہ ملے گا' تو یہ سب سنہری خواب ہی لگے ہوں گے۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء میں پاکستان بھی ایک سنہرا خواب ہی تھا۔ یقین اور عزم سے' اور جدوجہد سے' سنہرے خواب عملی جامہ پہن لیتے ہیں۔ کم ہمتی اور مایوسی سے ہونے والی چیزیں محض خواب ہی رہ جاتی ہیں۔ اگر گذشتہ ۴۰ سال میں کچھ نہیں ہو سکا تو وہ میرے اور آپ کے جیسے لوگوں کی اس روش کی وجہ سے ہی نہیں ہو سکا ہے کہ ہمارے کرنے سے کیا ہو گا؟ آج تک کون کیا کر سکا ہے؟ ہماری تحریر میں یہی دعوت ہے کہ اگر ہر وہ شخص جو اس دعوت کے حق ہونے کو مانے' اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے اور تاویلات و عذرات کی پناہ گاہ میں نہ چھپے' تو ۴۰ سال کیا' ۴۰ ماہ میں بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

۔آپ نے لکھا ہے کہ کون سی جماعت ہے جو دعویٰ نہیں کرتی' تو میرے بھائی' زندگی کے اور کس شعبے

میں' جہاں مدعی بہت ہوں لیکن کام ضروری ہو' یہ بہتات ہماری راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے؟ ڈاکٹر بہت سارے ہوتے ہیں لیکن مرض کا علاج کرنا ہوتا ہے تو ہم کسی نہ کسی ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ ہی لیتے ہیں۔ بیٹی کے کئی رشتے آجائیں تو کسی نہ کسی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھما ہی دیتے ہیں۔ پھر صرف دین کے فرائض کو ادا نہ کرنے کے لیے یہ بہتات سنگ گراں کیوں بن جائے!

نوجوانوں سے غلطیاں ہوں تو ان کا انکار نہیں' لیکن آپ کا یہ تاثر کہ جماعت' طلبہ کے ایک خاص طبقے کے ذریعے شورش' بے چینی اور بدامنی کی ذمہ دار ہے' کسی غلط فہمی یا غلط اطلاع کا نتیجہ ہے۔ یہ شورش اور بدامنی تو طلبہ کی جائز سرگرمیوں پر پابندی اور تعلیمی اداروں میں حکومت کے مسلح غنڈوں کے چھوڑے جانے کا نتیجہ ہے۔ جمعیت سے متعلق کوئی نوجوان غلطی بھی کر سکتا ہے لیکن جمعیت کا ایک عام نوجوان تو مطالعہ' کردار سازی' شب بیداری' اسٹڈی سرکل اور دعوت دین کے کام میں اپنی زندگی لگاتا ہے۔

آپ نے سیاست سے علیحدہ ہو کر فلاحی' تعلیمی اور اصلاحی کام کرنے کا مشورہ دیا ہے تو شاید اس لیے کہ آپ نے سیاست کے مفہوم پر غور نہیں کیا۔ فلاحی اور تعلیمی کام اگر تبدیلی معاشرہ کے لیے ہو تو سیاسی کام ہے' اور سیاست اگر اچھے معاشرے کی تعمیر کے لیے ہو تو فلاحی اور تعلیمی کام ہے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ تعلیمی کاموں سے مقبولیت حاصل کر کے سیاست کی جائے تو اس کا مرحلہ کبھی نہ آئے گا۔ فلاحی مقبولیت کا اپنا مقام ہے' دینی مقبولیت کا اپنا۔ اور سیاست تو پھر جنرل ضیا یا پیپلز پارٹی جیسی جماعتوں کا اجارہ رہے گی۔

امید ہے آپ مندرجہ بالا گزارشات پر غور کریں گے تو صحیح راہ پائیں گے اور دل و جان سے اس مقصد کے لیے کام کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے جو جماعت کا مقصد ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے' موت سر پر کھڑی ہے' کچھ کر لیجیے اس سے قبل کہ مہلت عمل ختم ہو جائے۔ قیل و قال کچھ کام نہ آئے گی' عمل ہی کام آئے گا (خرم مراد' اگست ۱۹۸۸ء)۔

قائد دل سے کام کرتا ہے-- دل سے سنتا ہے-- دل سے دیکھتا ہے-- دل کی سنتا ہے-- دل سے پوچھتا ہے-- دل کو پوچھتا ہے--- دل سے لیتا ہے-- دل کو دیتا ہے-- یہ دل کو بدلتا ہے' دل اس کو بدلتا ہے۔

قائد دلوں پر حکمرانی کرتا ہے-- لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب اس کا دل اس پر حکمران ہو-- اپنے دل کا مفتوح دوسرے کے دلوں کا فاتح بن جاتا ہے۔

قائد اپنے کام کو محض فرض کی تکمیل یا عہدے کو نبھانے کی غرض سے نہیں کرتا ہے-- بلکہ وہ اپنے کام سے محبت کرتا ہے۔ اپنی قیمتی متاع-- "زندگی" کو اس محبت پر نچھاور کر دیتا ہے- اس کا کام-- اس کا مقصد ہوتا ہے- اس کی محبت اس کے کام کو حسین اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔

قائد کا دل جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر کی بات سنتا ہے-- اس سے عہد کرتا ہے- دل کی اتھاہ گہرائیوں سے حکمت کے موتی سمیٹتا ہے اور بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے- قائد کا دل-- قائد سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ قائد تھک بھی جائے' اس کا دل نہیں تھکتا۔ قائد بیٹھے تو دل اس کو اٹھا دیتا ہے-- دل متحرک رہتا اور متحرک رکھتا ہے-- قائد اپنے دل کا خیال رکھتا ہے' اس کو توانائی فراہم کرتا ہے۔

قائد اپنے دل کی مٹھی میں ہوتا ہے اور اس کا دل اس کے رب کی مٹھی میں ہوتا ہے- وہ سمع و بصر' ذکر و فکر' جہد و سعی اور حب و وفا کے ذریعے وہ ماحول فراہم کرتا ہے جس میں ماہیت قلب استوار ہوتی ہے' زور پکڑتی ہے اور اس دنیا کے زمان و مکاں کی حدود سے باہر نکل کر ارض و سموات سے بلند ہو کر رب کریم کے نور کی بدولت ایک چراغ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

قائد کا کردار اسی چراغ کا پرتو ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھاتے ہیں

وعن ابی کبشة الا نماری انه سمع رسول الله يقول ثلث اقسم عليهن ---- ما نقص مال عبد من صدقة ولا ظلم عبد مظلمة صبر عليها الا زاده الله بها عزا ولا فتح عبد باب مسئلة الا فتح الله عليه باب فقر (ترمذی)

حضرت ابو کبشہؓ انماری سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: تین باتیں ہیں جن پر میں قسم کھاتا ہوں۔

☆ بندہ کا مال راہ خدا میں خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔

☆ جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور اس کا مال ناحق لے لیا جائے اور وہ بندہ اس پر صبر کرے تو اللہ اس کی عزت بڑھاتا ہے۔

☆ اور جس بندہ نے اپنے نفس پر سوال (مانگنے) کا دروازہ کھولا' اللہ تعالیٰ اس کے لیے فقر و افلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

کتاب نما

تیسیر القرآن، جلد اول، مولانا عبدالرحمٰن کیلانی۔ ناشر: مکتبۃ السلام گلی ۲۰، وسن پورہ، لاہور۔
صفحات: ۶۷۹۔ قیمت: ۱۸۰ روپے۔

کیلانی مرحوم کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ بچپن ہی میں والد نے قرآن پاک باترجمہ پڑھا دیا۔ قرآن سے یہ تعلق عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ فطری اور طبعی ذوق جستجو کے نتیجے میں مرحوم نے مترادف القرآن تصنیف کی۔ پھر ایک مختصر کتابچہ قرآن نافہمی کے اسباب اور ان کا حل بھی تحریر کیا۔ وہ اعلیٰ درجے کے خوش نویس بھی تھے۔ قرآن حکیم کے جو مختلف نسخے حکومت سعودی عرب نے شائع کیے ان میں سے ایک مصحف المدینۃ النبویۃ کے قرآنی متن کے سلسلے میں مرحوم کیلانی صاحب کے کتابت شدہ خط کو ہی منتخب کیا گیا۔ زیر نظر تفسیر کا قرآنی متن بھی ان کا اپنا کتابت شدہ ہے۔ (ترجمہ اور تفسیر کی کتابت مشینی ہے مگر اچھی خوبصورت)۔

تیسیر القرآن کی یہ جلد اول سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الانعام کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں اسے "تفسیر بالحدیث" قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کسی بھی موضوع یا مسئلے پر زیادہ سے زیادہ احادیث کے حوالے دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانیؒ نے دیباچے میں کہا ہے کہ یہ تفسیر کے کسی خاص مسلک یا فقہ کی ترجمانی کے بجائے براہ راست قرآن حکیم، صحاح ستہ کی صحیح اور حسن درجے کی احادیث اور اقوال صحابہ و تابعین پر مبنی ہے (ص ۴)۔

مؤلف نے یہ تفسیر اپنے "علمی ذوق کی سیرابی کے لیے" لکھی ہے اور متعدد اردو تفسیروں، بشمول تفہیم القرآن کو پیش نظر رکھا ہے۔ صاحب تفسیر کا انداز معذرت خواہانہ نہیں ہے بلکہ باطل فرقوں اور گروہوں کی کوتاہیوں پر تنقید کرتے ہوئے "بدعی اور مشرکانہ خیالات پر ضرب کاری" لگائی ہے۔ اس تفسیر میں بعض مسائل پر تفصیل سے لکھا گیا ہے، جیسے: میراث کا مسئلہ (سورۃ النساء)۔ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسَ (المائدہ ۵:۶۷) کی تفسیر میں ۱۷ ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو رسول اکرمؐ کے قتل کی سازش سے متعلق تھے۔ قدجاء کم من اللّٰہ نورٌ وکتابٌ مبین (المائدہ ۵:۱۵) کی تفسیر بھی خاصی مفصل ہے۔

ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ سرسید احمد خاں نے "مغرب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی" (ص ۱۸)۔ اس طرح یہ کہنا بھی محل نظر ہے کہ: "زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام سے فی الواقع انھی معنوں میں عشق تھا' جو مشہور و معروف ہیں" (ص ۳۴)۔ اول تو "زلیخا" افسانوی نام ہے۔ دوم: قرآن کے مطابق تو عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسفؑ پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور ایک روز انھیں صریحاً زنا کی ترغیب دے ڈالی (یوسف ۱۲:۲۳)۔ اسے "عشق" کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے--- لفظ "دہریئے" (ص ۴۵) اور گذارش (۶۸۰) کی صحیح کتابت "دہریے" اور "گزارش" ہے--- وغیرہ۔

قرآن حکیم کے تفصیلی اور تقابلی مطالعے کے لیے یہ ایک مفید کوشش ہے (رفیع الدین ہاشمی)۔

اصول فہم قرآن' مولانا امین احسن اصلاحی۔ ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث' رحمٰن سٹریٹ' مسلم روڈ' سمن آباد' لاہور۔ صفحات: ۵۸۔ قیمت: ۳۴ روپے۔

اس مختصر کتاب میں مرتب عبداللہ غلام احمد نے مولانا اصلاحی کے بعض لیکچروں کو ٹیپ سے اتار کر پیش کیا ہے۔ قرآن فہمی میں مولانا کا مقام محتاج بیان نہیں۔ قرآن کو براہ راست سمجھنے میں جو اِشکالات پیش آتے ہیں' ان کے پیش نظر ہمارے ہاں ایک رجحان قرآن کو خود سے سمجھنے کی کوشش نہ کرنے بلکہ ۱۰۰ فی صد تفسیروں پر انحصار کرنے کا ہے۔

مولانا اصلاحی کا نام اس حوالے سے ممتاز ہے کہ انھوں نے ان اصولوں کو سمجھایا اور عام کیا ہے جنھیں اختیار کر کے ایک عام پڑھا لکھا شخص براہ راست قرآن سے اکتساب فیض کر سکتا ہے۔ اس کتابچے میں قرآن کی دعوت کے عقل و فطرت پر مبنی ہونے' اس کی ترتیب کے اتفاقی نہیں توفیقی ہونے اور اس کی زبان کے قریش کی زبان ہونے کو رواں' عام فہم انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی اچھے انداز سے کی گئی ہے۔ قرآن کے طالب علموں کے لیے ایک نہایت مفید کتاب ہے (مسلم سجاد)۔

انسان اور اس کے مسائل' سید جلال الدین عمری۔ ناشر: اعلیٰ پبلی کیشنز' یوسف مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۱۰۴۔ قیمت: ۳۶ روپے۔

انسانی زندگی میں شب و روز ایسے مسائل سر اٹھاتے رہتے ہیں جنھیں سمجھے بغیر انسانی قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں نہیں رہ سکتا' جس قدر انسان قدیم ہے اسی قدر اس کے مسائل قدیم ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں بھارت میں چھپی تھی' اب اس کا عکس لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔

عمری صاحب نے کائنات میں انسان کی حیثیت اور انسانی مسائل کو اپنی گفتگو کا عنوان بنایا ہے۔

آمریت' قومیت' سائنس' جمہوریت' مادہ پرستی اور شرک نے انسان کے لیے جو مسائل پیدا کیے ہیں ان پر الگ الگ ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ اسلام نے انسان' انسان کی منزل اور انسان کے لیے مجوزہ لائحہ عمل کی وضاحت توحید' رسالت' آخرت' مواسات' احترام قانون اور شریعت کی بالادستی کے ذریعے کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون نے اپنے ماننے والوں کے لیے امن' سلامتی' عزت نفس انسانی اور عالمگیر خیرخواہی کا راستہ بھی کھول دیا ہے۔

سید صاحب کا انداز داعیانہ ہے۔ وہ دقیق مسائل کو روز مرہ مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ ماضی قریب میں فلسفے اور دور جدید میں سائنس نے جس طرح انسانی ذہن کو مسحور کیے رکھا ہے' اس پر بھی کلام کیا گیا ہے۔ سید صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان خدائی رہنمائی سے الگ تھلگ ہو کر جو راستہ اختیار کرے گا اس میں اس کے بھٹکنے اور دوسرے انسانوں کو گمراہ کرنے کے وسیع امکانات موجود ہیں' اس لیے اسلام کے ماننے والے بھی اس کے پیش کردہ نتائج کا فہم حاصل کریں اور اس کے ساتھ ساتھ اس پیغام کی حقانیت کو بھی اقوام عالم کے سامنے پیش کریں (محمد ایوب منیر)۔

اسلام اور ذات پات' ڈاکٹر مظہر معین۔ ناشر: ادبستان' ۴۳- ریٹی گن' لاہور۔ صفحات: ۴۶۴۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

اسلام کا مزاج آفاقی ہے مگر بدقسمتی سے مرور زمانہ کے ساتھ مسلم معاشرہ بھی جاہلی تعصبات سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ برعظیم میں ہندو سماج کے زیراثر مسلمانوں کے ہاں ذات پات کا امتیاز برتا جانے لگا۔ بیسویں صدی کی تحریکات آزادی کا ایک قابل قدر اور روشن پہلو یہ ہے کہ ان کے ذریعے مسلمانوں کے ہاں اسلامی اور ملی تشخص کا جذبہ نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ ملی تشخص کے اسی جذبے کی بنا پر' پاکستان جیسا عظیم الشان ملک وجود میں آیا لیکن بدقسمتی سے ہندی مسلمانوں کی نفسیات میں ذات اور برادری کے تعصبات اس طرح رچ بس گئے تھے کہ یہ ملی جذبہ بھی ان تعصبات کو کلیتاً ختم نہیں کر سکا۔

گذشتہ چند برسوں میں مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب بڑھا ہے' دینی اور اسلامی تحریکوں کے اثرات میں اضافہ ہوا ہے اور مسلمانوں کے اندر خوش حالی کے نتیجے میں حج اور عمرے کا رجحان بھی خاصا زیادہ ہو گیا ہے اور معاشرے میں ایک عمومی دین داری کی فضا بھی نظر آنے لگی ہے لیکن ان تمام قابل قدر رجحانات کے باوجود نمود و نمایش کا رجحان اور بتان رنگ و بو کا شکنجہ ہماری معاشرتی زندگی کو ابھی تک بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

مصنف نے مسلم معاشرے کی اسی دکھتی رگ کو چھیڑا ہے۔ انھوں نے قرآن حکیم' سیرت رسولؐ اور

اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں ذات پات کے اسی جاہلی تصور کا تجزیہ کیا ہے۔ معاشرتی رویوں اور شادی بیاہ کے معاملات میں خاندانی امتیازات اور بے جا قسم کے تفوق اور برتری کے جھوٹے معیارات' طرح طرح کے فتنہ و فساد' جھگڑوں اور مقدموں کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقی اسلامی تصورات اور ہمارے خود ساختہ معیارات میں بعدالمشرقین ہے اور ہم ذہنی و فکری اور معاشرتی و تمدنی اعتبار سے ابھی بہت کچھ اصلاح و ہدایت کے محتاج ہیں۔ زیر بحث موضوع پر پروفیسر موصوف نے جو کاوش و عرق ریزی کی ہے وہ ان کے دلی اضطراب' دردمندی اور شدید اصلاحی جذبے کی غماز ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کے حق میں جو تفصیلی شواہد مہیا کیے ہیں' وہ بہت مسکت' مستند اور جامع و مانع ہیں کیونکہ انھوں نے ذات پات اور نسلی اور نسبی تفریق کے موضوع پر مختلف مکاتب فکر کے نامور مفسرین' محدثین اور علماے کرام نیز زمانۂ حاضر کے بعض دانش وروں کی آرا جمع کر دی ہیں (د - ہ)۔

اسلام کی عادلانہ اقتصادی تعلیمات' محمد طاسین۔ ناشر: مجلس علمی فاؤنڈیشن' شعبہ اقتصادیات' المدینہ گارڈن' جمشید روڈ نمبر ۲' کراچی۔

مولانا محمد طاسین اسلامی معیشت کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتب اور مقالات لکھ چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مولانا نے اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام جس عادلانہ نظام معیشت کو پیش کرتا ہے اس کا ایک دائرہ تو وہ ہے جس میں افراد اپنی اخلاقی تربیت اور حسن سلوک کے ذریعے معاشی فرق و امتیاز کو مٹانے اور پس ماندہ طبقات کو اٹھانے کے لیے سعی و جہد کرتے ہیں' اور دوسرا اہم شعبہ وہ ہے جس میں حکومت و ریاست اپنے اختیارات کو بروئے کار لا کر قانون سازی کے ذریعے ظلم و استحصال کا خاتمہ کرتی ہے۔ مصنف نے ایسے بارہ اقدامات کی نشان دہی کی ہے جن کے ذریعے اسلامی ریاست' معاشی عدل کا قیام عمل میں لاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر لوگوں کو کسب معاش کی جدوجہد پر لگانا' معاشی جدوجہد کے مواقع مہیا کرنا' کام کرنے والوں کے لیے مناسب معاوضے کا انتظام' صرف جائز حق ملکیت کا تحفظ' اور اس کے انتقال کی اجازت' تبادلہ اشیا و خدمات کے لیے حقیقی رضامندی کو لازمی شرط قرار دینا' انفاق کا فروغ لیکن بخل کی طرح اسراف و تبذیر کی بھی بیخ کنی' معیار معیشت میں سادگی اور بے جا امتیازات کا خاتمہ' محتاج و مساکین کی معاشی کفالت کا اہتمام' نظام زکوٰۃ کا موثر نفاذ' قانون وراثت' وصیت اور نفقات پر عمل درآمد وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا خطوط پر نظام معیشت کو استوار کرنے سے ایک مثالی' متوازن اور خوش حال معاشرہ وجود میں آسکتا ہے' لیکن یہ انقلابی کام وہی حکومت انجام دے سکتی ہے جو حقیقی معنوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی مطیع فرمان ہو اور جس کی نگاہ میں اسلامی نظام حیات کا قیام و نفاذ اس کی

اولین ترجیح ہو۔ ایسی ہی مخلص حکومت اپنی قانونی اور انتظامی پالیسیوں کے ذریعے وہ سازگار ماحول وجود میں لاسکتی ہے جو اسلام کے منصفانہ معاشی اصولوں کے بارآور ہونے کی ضمانت دے سکتا ہے۔ محض عقائد کی پختگی سے اس کا وقوع پذیر ہونا امر محال ہے (پروفیسر عبدالحمید ڈار)۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ' عبدالرشید عراقی۔ ناشر: نور اسلام اکیڈمی' لاہور۔ صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۴۸ روپے۔

برعظیم میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی شیعہ سنی چپقلش کھل کر سامنے آنے لگی (اور مسلمانوں کے سیاسی زوال میں اس کا ایک اہم کردار تھا)۔ ہندووانہ رسموں کی طرف بھی مسلمانوں کا میلان بڑھنے لگا اور ان کے اندر جاہلانہ بدعات کا تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی یہود و نصاریٰ کے ہاں پائی جانے والی خرابیاں سرعت سے مسلمانوں کی ثقافت کا حصہ بننے لگیں۔ ان حالات میں قدرت حق نے شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشین علما و زعما کے ہاتھوں علوم قرآن و حدیث کی نشات ثانیہ کا کام لیا۔ اس چیز نے مسلمانوں کو اپنے دین کا فہم و تدبر بھی بخشا اور اپنی اصلاح کا شعور بھی عطا کیا۔

زیر نظر کتاب اپنے نام کے حوالے سے اگرچہ شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے علمی' عملی اور ادبی کارناموں پر مشتمل کتاب دکھائی دیتی ہے لیکن اس میں شاہ صاحب کے علاوہ ان کی اولاد کی علمی' تحقیقی' تدریسی' تبلیغی اور جہادی خدمات کا الگ الگ بھرپور تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ مقدمے میں اس وقت کے عالم اسلام کے سیاسی اور تمدنی حالات اور ہندستان پر بیرونی حملوں اور ان کے اثرات کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں مصنف نے شاہ ولی اللہ کے مختصر سوانحی خاکے کے بعد ان کے تدریسی اور تجدیدی کارناموں' اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن' قرآن کے فارسی ترجمے فتح الرحمٰن' حدیث و سنت کی ترویج' فقہ کی تدوین اور ان کی معرکہ آرا تصنیف حجة اللہ البالغہ کے آئینے میں شریعت اسلامی کی ترجمانی وغیرہ جیسے موضوعات کو خالص تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ' شاہ عبدالعزیزؒ' شاہ رفیع الدینؒ' شاہ عبدالقادرؒ' شاہ عبدالغنیؒ' شاہ اسماعیل شہیدؒ' شاہ محمد اسحاقؒ اور ان کے بعد سید نذیر حسین دہلویؒ کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف لکھتے ہیں: "اس وقت برصغیر میں جہاں بھی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنائی دیتی ہے' وہ اسی خانوادۂ فضل و کمال کی خیر و برکت کی صداے بازگشت ہے"۔

مصنف نے حالات و واقعات پر اپنی طرف سے بہت کم تبصرہ شامل کیا ہے۔ یہ کتاب مؤلف کی دقیق نظری اور محنت پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ مختلف حوالوں کی بار بار تکرار سے کہیں کہیں گرانی محسوس ہونے لگتی ہے۔ طباعت دیدہ زیب ہے (سعید اکرم)۔

آل محمدؐ کا مہمان، آغا امیر حسین۔ ناشر: کلاسیک، چوک ریگل، مال روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۵۶۔ قیمت: یک صد روپے۔

ماہنامہ سپتِنک کے مدیر آغا امیر حسین کو ۱۹۹۷ء میں عراق، شام اور ایران کے مقدس مقامات کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ اپنے سفر شوق کو انھوں نے جذبات عقیدت میں اس طرح ڈوب کر تحریر کیا ہے کہ قاری آغا صاحب کے ذوق مطالعہ، مسلم شخصیات سے بے پایاں لگاؤ اور تاریخ نویسی کی داد دیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اردو سفرناموں کے انبار میں زیر نظر سفرنامے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں اہم ترین مقامات کی ۸۰ سے زائد عمدہ تصاویر انتہائی قریب سے بنا کر شامل اشاعت کی گئی ہیں۔

مکرمہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد دمشق، بغداد، قاہرہ اور استنبول کے ذکر ہی سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک منظر مرتب ہوتا ہے۔ امت مسلمہ جب ہزار سالہ عروج و اقتدار کے بعد زوال کا شکار ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہونا شروع ہوئی تو برعظیم میں مسلم حکمرانوں کے کئی خاندان اور ایران و شام میں کتنے ہی بادشاہ "سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف" کے گیت گنگناتے نظر آتے ہیں۔

عراق میں حضرت امام حسینؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارات زیارت گاہ خاص و عام بنے رہتے ہیں، اسی طرح وہاں حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت امام موسیٰ کاظمؒ، حضرت امام علی نقیؒ کے علاوہ معرکۂ کرب و بلا میں شریک کتنی ہی پاکیزہ ہستیوں کے مدفن ہیں۔ ان سب کے تاریخی کردار، مقامات تدفین اور ان کے حالات زندگی سے آغا امیر حسین خوب آگاہ ہیں، وہ ہر ہر مقام کے بارے میں عقیدت سے احترام سے لکھتے ہیں۔ ایران میں دسترخوان امام رضاؒ، چہل دختران کے مزار کے علاوہ بیسویں صدی کی اہم سیاسی و مذہبی شخصیت امام خمینی کے مزار کی تفصیلات بھی موجود ہیں اور شام کے تاریخی مقامات کا تذکرہ بھی۔

مصنف نے کوشش کی ہے کہ تاریخی واقعات، مذہبی معلومات، ذاکرانہ روایات اور ذہنی واردات کو یکجا کر دیا جائے۔ تاریخی حوالے سے بعض واقعات اختلافی ہیں۔ عراق، شام اور ایران کی اقتصادی حالت، عوام الناس کے طرز زندگی، تعمیر و ترقی کی رفتار اور سیاسی نشیب و فراز کے بارے میں بھی مناسب معلومات موجود ہیں (م-ا-م)۔

رحمٰن، قرآن، انسان، پروفیسر رشید احمد انگوی۔ الخلیل ریسرچ سنٹر، ۶۹ سی، اعوان ٹاؤن، لاہور۔ صفحات: ۳۰۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

امت میں قرآن کی طرف رجوع اور خدمت قرآن کا شوق ایک خوش آیند امر ہے۔ اس

خوب صورت کتاب کے تین حصے ہیں۔ تیسرا حصہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ صاحب مضمون نے قرآنی مضامین کو تدریجی اشکال کے ذریعے نکات کی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے تقریباً ۵۰ صفحے کے جو چارٹ اور سلائیڈیں پیش کی ہیں ان سے مقرر یا مدرس کا کام آسان ہو گیا ہے۔

پہلے دو حصوں میں سے پہلے کو "اشارات" قرار دیا ہے اور دوسرے کو "قدرے تفصیلی مضامین"۔ تبصرہ نگار کا تاثر یہ ہے کہ صاحب کتاب نے جو دروس قرآن دیے ہیں' ان کے نکات پر مبنی یہ کتاب تیار ہوئی ہے۔ ہر موضوع اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن ان میں باہمی ربط پیدا کرنے کی گنجایش موجود ہے۔ ۱۴+۲۲ موضوعات پر درس قرآن دیے گئے ہیں۔ بعض مختصر (۲ ص) ہیں بعض طویل (۲۰ ص)۔ دین کامل کے عنوان سے درس میں انسان کی جسمانی ساخت اور حیاتیاتی وجود کے ذکر میں علم حیاتیات کی جھلک نظر آتی ہے۔

اشارات ہوں' تدریجی اشکال ہوں یا مختصر درس' صاحب کتاب نے قرآن کے مرکزی موضوع کو سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کے پس منظر میں' انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں' مثلاً اللہ کو سپرپاور قرار دینا' تنوع کے لیے ورائٹی کا لفظ وغیرہ۔ آیات کے عربی متن تقریباً نہیں دیے گئے ہیں۔ قرآن رحمٰن کا پیغام ہے کہ انسان کی ایسی تربیت ہو کہ وہ اس پیغام کو لے کر کھڑا ہو' اس راہ میں ہر صعوبت کو برداشت کرے۔ دنیا کے امتحان سے کامیابی سے گزرے اور اپنے رب کو راضی کر دے' اس کی جنت تک پہنچے (م-س)۔

کتاب فلاح' پروفیسر محمد منظور علی شیخ۔ علمی کتاب خانہ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۵۶۴۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

بظاہر ایک عام سی کتاب ہے لیکن جب دیکھا جائے اور پڑھا جائے تو اس کی خوبیاں واضح ہوتی چلی جاتی ہیں۔ عموماً دین کے تقاضوں کو سمجھانے والی کتب کا انداز کچھ خشک سا ہوتا ہے یا متن میں اتنی عربی آجاتی ہے کہ ایک عام قاری کا سلسلہ فہم بار بار ٹوٹتا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ آیات و احادیث کے مفہوم کو اردو متن میں سمو دیا گیا ہے اور ان کے عربی حوالے باب کے اختتام پر دے دیے گئے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھا' کتاب فلاح سے مراد یہاں قرآن پاک نہیں ہے' بلکہ خود یہ کتاب ہے جس میں قرآن پاک سے رہنمائی حاصل کر کے فلاح کے راستے کو واضح کیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بہت اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ اسے بھی کتاب کی خوبی کہا جائے گا کہ مصنف قاری سے بے نیاز ہو کر نہیں لکھ رہا بلکہ اسے واقعی قاری کی فلاح سے تعلق ہے۔ چنانچہ اس کی دردمندی اور اخلاص ان دعاؤں سے ٹپکا پڑتا

ہے جو وہ جگہ جگہ اپنے رب کے حضور اپنے لیے اور قاری کے لیے کرتا ہے۔

کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اپنے مطلب کو بیان کرنے کے لیے خوب صورت اچھے اشعار سے مدد لی گئی ہے۔ کئی جگہ پنجابی اشعار بھی ہیں۔ اگر ان کے اردو ترجمے کا التزام کیا جاتا تو اچھا تھا۔

اگر کتاب کے حصے کیے جائیں تو ۱۳۰ صفحات تک بنیادی مباحث بیان کیے گئے ہیں یعنی دنیا اور اس میں انسان کی حیثیت۔ پھر ۲۰۰ صفحات میں کامیابی کے عملی طریقے کے عنوان سے متعین نیکیوں پر ابواب لکھے گئے ہیں' مثلاً شکر' ذکر' انفاق' احسان' پاک دامنی' توکل' تقویٰ وغیرہ اور ۱۰۰ صفحات متعین منکرات پر ہیں جن سے بچنا چاہیے: مثلاً جھوٹ' غصہ' بخل' زنا' غیبت وغیرہ۔ ان میں سے ہر باب مختصر' جامع اور دل نشین ہے اور اپنی جگہ خود ایک باب فلاح ہے۔ دعا کے باب میں قرآنی اور نبویؐ دعاؤں کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ آخری حصے میں ۱۰۰ صفحات تک پانچ عنوانات کے تحت بہترین اعمال کی تلقین کی گئی ہے: نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو' توبہ استغفار کرو' نبیؐ پر درود بھیجو' اپنے رب سے دعا مانگتے رہو۔

اپنی شخصیت کی تعمیر کرنے کی خواہش رکھنے والے کسی بھی مسلمان کے لیے یہ واقعی ایک کتاب فلاح ہے۔ اس کا اصل زور علمیت سے زیادہ عملی رہنمائی پر ہے۔ سلیس رواں اردو میں بیان کیا گیا ہے اور کیونکہ مضامین کا مآخذ قرآن اور حدیث ہیں اس لیے ضروری باتیں متوازن اہمیت کے ساتھ اچھے انداز سے آگئی ہیں۔

کوئی نجی تعلیمی ادارہ اس کتاب کو اپنی درسی کتاب بنا سکتا ہے' کوئی ادارہ یا پروفیسر صاحب خود اس پر خط و کتابت کورس مرتب کر کے اس کی تعلیم بذریعہ ڈاک بھی دے سکتے ہیں۔ اس ضخیم مجلد کتاب کی قیمت صرف ۱۲۰ روپے رکھنا بھی شاید اسی لیے ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھ میں پہنچے اور ان کی فلاح کا باعث ہو (م - س)۔

مدیر کے نام

میجر طارق محمود ' پشاور

مراد ہوف مین نے ایک بحث چھیڑی ہے (جون ۲۰۰۰ء) کہ اسلام کے فروغ اور تبلیغ کے لیے مسلمانوں پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور کیا طریقۂ کار اس کام کے لیے اختیار کیا جائے؟ میرے خیال میں مسلمانوں پر جو بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ معیار اخلاق خصوصاً معاملات میں پیش کرنا ہے جس کا مطالبہ ان سے مذہب کرتا ہے کیونکہ مثال' زبانی تلقین کے مقابلے میں زیادہ مؤثر چیز ہے۔ لیکن کیا ہمارے دعوتی اداروں نے کبھی مختلف ذرائع تبلیغ کی سائنسی خطوط پر تحقیق کی ہے کہ کون سا طریقۂ کار بہتر نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ اس دور میں انسانی دماغ کے بارے میں بہت ترقی اور تحقیق ہوئی ہے۔ کیا اس موضوع پر غور کرنے کی ضرورت نہیں؟ اکثر ہم نو مسلم مرد و خواتین کے حالات پڑھتے ہیں کہ وہ دین میں کیسے داخل ہوئے۔ اس حوالے سے تحقیق ہونا چاہیے کہ کیا طریقے زیادہ مؤثر ہیں؟

گل زادہ شیربانو ' مردان

اشارات (جون ۲۰۰۰ء) "خشک سالی اور قحط' قوم کے اجتماعی ضمیر کے لیے ایک چیلنج" بروقت بیداری کی کوشش ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں' جب کہ ہمارے بعض نام نہاد دانش ور' جو ایٹمی دھماکوں کے خلاف ہیں' اس قحط اور خشک سالی کو ایٹمی دھماکوں کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔ ایسے میں خشک سالی کی مادی وجوہات پر ماہرانہ گفتگو کر کے ملک دشمن دانش وروں کو خاموش کرنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ "خواتین ۲۰۰۰ء جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس" میں انسانیت کے خلاف ایک عظیم سازش سے بروقت آگاہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سعد اللہ خان عابد ' مردان

اشارات (جون ۲۰۰۰ء) بہت اہم ہیں۔ قحط سالی ابھی تک جاری ہے مگر افسوس ہے کہ پاکستانی قوم اور حکمران اب بھی لہو و لعب میں مبتلا ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر امدادی موسیقی شو کیے جا رہے ہیں۔ کیا یہ اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف نہیں؟ ایک طرف ملک کی بڑی آبادی مشکلات میں پھنسی ہوئی ہو اور دوسری طرف اس کی امداد کے لیے ارباب اقتدار موسیقی اور ناچ گانے کے ذریعے امدادی شو منعقد کریں' یہ بے حسی نہیں تو اور کیا ہے! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عذاب سے نجات کے لیے اللہ کے در پر سربسجود ہوتے اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے مگر الٹا ہم اس کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم کرے!

پروفیسر سید ریاض حسنین زیدی ' ساہیوال

رسائل و مسائل (جون ۲۰۰۰ء) میں سگریٹ نوشی کے بارے میں ٹھوس ثبوت دیے گئے ہیں' لیکن افسوس کہ ہمارا

میڈیا اور قومی پریس سگریٹ کے اشتہاری عزائم میں پوری طرح ممد و معاون بنا ہوا ہے بلکہ ہر اشتہار کے آخر میں "سگریٹ نوشی مضر صحت ہے" کا اعلان منافقت و مداہنت کی بدترین شکل بنتی جا رہی ہے۔ ہمیں سگریٹ نوشی کے خلاف پورے جوش و جذبے سے متحرک ہونا پڑے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سن رکھو اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تفقہ نہیں ہے، اور اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے، اور اس قرآن خوانی میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تدبر نہیں ہے۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا